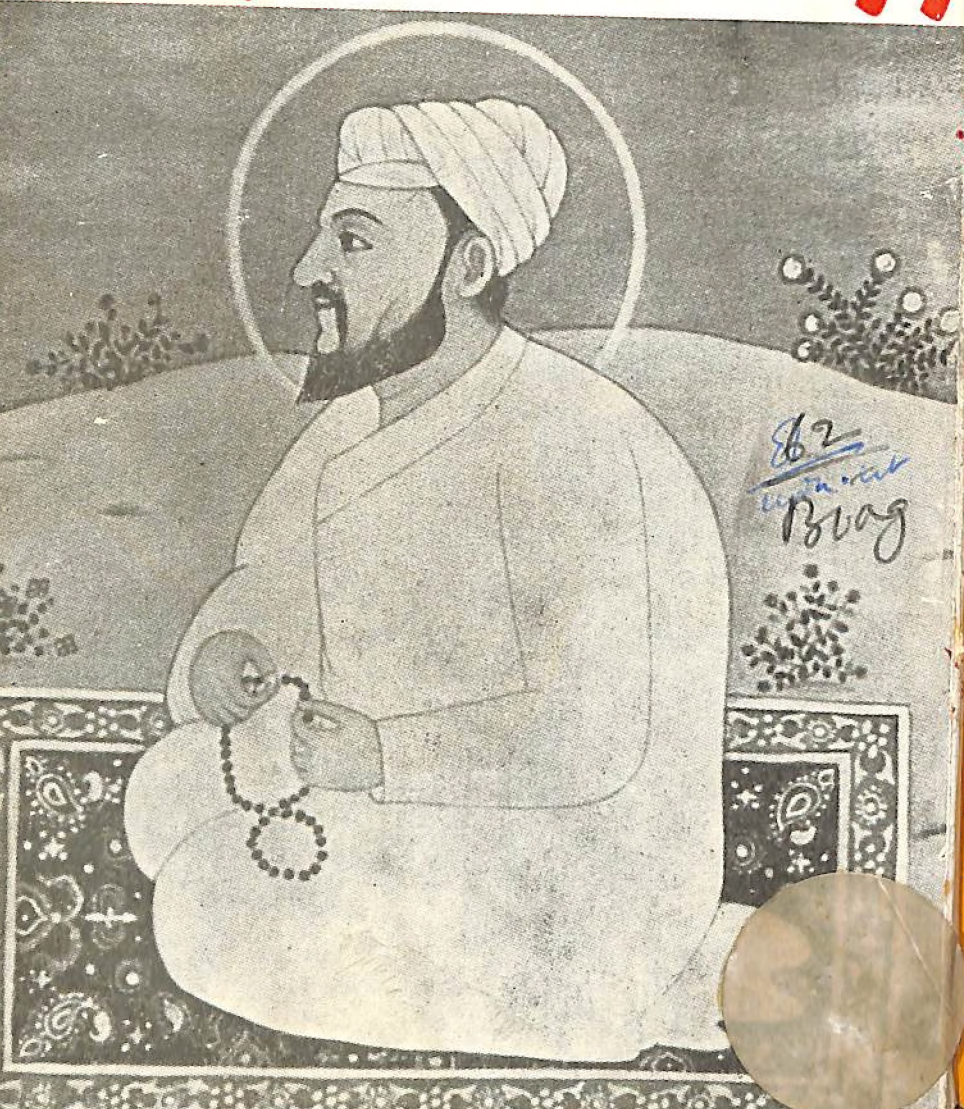
بابا شیخ فرید

گربچن سنگھ طالب





بابا شیخ فرید

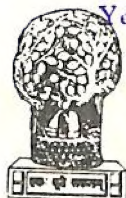
قومی سوانح حیات کا سلسلہ

بابا شیخ فرید

گربچن سنگھ طالب

مترجم

عتیق صدیقی



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

نئی دلی

(1899) 1978

BABA SHEIKH FARID (URDU)

قیمت : 7/25

تقسیم کار
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دلّی 110025 ، دہلی 110006 ، بمبئی 400003 علی گڑھ 202001

ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا A/5 گرین پارک نئی دلّی 110016 نے
لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی 110002 میں
چھپوا کر شایع کیا۔

دیباچہ

پیش نظر کتابچہ اُس سلسلۂ اشاعت کی جدید ترین کڑی ہے، جسے نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے "قومی سوانح" کے نام سے شروع کیا ہے۔ بابا شیخ فرید (1173ء - 1265ء) زیادہ تر مسلمانوں ہی میں ایک مصلح کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ لیکن اس کتابچے کی وساطت سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ان کی شخصیت کے ایک سے زیادہ اہم پہلو ہیں۔ عظیم اور روشن خیال مصلح ہونے کے علاوہ مشہور صوفی اور ولی شیخ نظام الدین اولیا دہلوی کے وہ مرشد بھی تھے، جن کے آستانے پر صدیوں سے چھوٹے بڑے سر عقیدت خم کرتے رہے ہیں۔ اس سے قطع نظر، شیخ فرید نے اپنی مادری زبان میں جو شاعری کی تھی اس کا گرو نانک اور ان کے جانشینوں نے مطالعہ کیا اور اُسے گرنتھ صاحب میں جگہ دی، جو سکھوں کا مذہبی صحیفہ ہے۔ سکھ آج بھی ان کی شاعری کا احترام کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ گرنتھ صاحب میں شیخ فرید کے کلام کی شمولیت بین المذاہبی خیرسگالی کی تاریخ کا عدیم المثال اور انتہائی اہم واقعہ ہے، جو انسانی زندگی میں مذہب کے رہنما قوت ہونے کا روشن خیال نظریہ پیش کرتا ہے۔ شیخ فرید کی شاعری میں عمیق روحانی بصیرت ہے جو اعلاترین فطری شعری ذوق کی پیداوار ہے۔ اسی بنا پر ان کا کلام پنجابی بولنے والوں کے ثقافتی ورثے کا عزیز ترین حصہ بن گیا ہے۔ آگے آنے والے صفحات میں ان ہی نکتوں کو، نسبتاً تفصیل سے، بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک نے جو عظیم ترین شخصیتیں پیدا کی ہیں، ان ہی میں ایک شیخ فرید بھی تھے، وہ ایک ایسے دور میں خیرسگالی،

انسانیت دوستی اور امن و آشتی کا پیام لائے تھے جو جنگ وجدال اور تشدد کا دور تھا۔ یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ان کے جیسے انسان کی بابت جملہ متعلقہ معلومات عوام کے سامنے پیش کی جائیں۔ ان کا کلام آج کے اُس ماحول کے لیے بہت مناسب حال ہے، جس میں بڑے کرخت لہجے میں نفرت و عداوت کی آوازیں وقتاً فوقتاً سنائی دیتی رہتی ہیں اور جہاں انسان نے داخلی سکون کے حصول کے لیے خدا کی راہ پر اب تک چلنا سیکھا نہیں ہے۔ آج جب کہ مادّیت وکلبیت کی آندھیاں چل رہی ہیں، بابا فرید کے وہ نغمے حد درجہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں جو انسانی دل کے اُن تاروں کو چھیڑتے ہیں جو خوابیدہ تو ہیں، مگر مُردہ نہیں ہوئے ہیں۔

1973 میں شیخ فرید کی پیدائش کے آٹھ سو سال پورے ہو گئے ہیں۔ اسی نے پیش نظر کتاب کی تصنیف کی تقریب فراہم کی تھی۔ اس عظیم انسان کی یاد کو شایانِ شان منائے جانے کا اہتمام کیا گیا اور یہ طے پایا کہ شیخ فرید کی سوانح حیات بھی مرتب کی جائے، خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ پیش نظر کتاب میں شیخ فرید کی مختصر سوانح حیات کے ساتھ ساتھ، جو اصلی فارسی ماخذ پر مبنی ہے، فلسفۂ تصوّف کو بھی سیدھے سادھے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے، خصوصاً اس تصوّف کو جس نے ہمارے ملک میں ایک عظیم تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کے علاوہ شیخ فرید کی شاعری کے مخصوص پہلوؤں سے بھی ناظرین کو متعارف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں شیخ فرید کا وہ پنجابی کلام یا اس کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، جو گرنتھ صاحب میں ملتا ہے۔

پنجابی، فارسی اور عربی کے جو اقتباسات اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں، ان کا انگریزی میں ترجمہ خود مصنف نے کیا۔ آخر میں کتابیات کے علاوہ ایک نقشہ

بھی منسلک کیا گیا ہے، جس سے پاک پٹن کا محل وقوع معلوم ہوگا جہاں شیخ فرید کی گدی تھی۔

نوٹ: اس کتاب میں جگہ جگہ شیخ فرید کے پنجابی کلام کے لیے 'بانی' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ گرنتھ صاحب میں جو اجزا شامل ہیں، انھیں سکھ روایات کے مطابق 'بانی' ہی کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ سنسکرت سے ماخوذ ہے، جس کے لغوی معنی ہیں 'بولی'۔ اس کتاب میں حواشی بھی بہت زیادہ نہیں ہیں، اور جو ہیں وہ اُن ناظرین کے لیے سودمند ہوں گے جو تصوف کی روایات سے، شیخ فرید سے یا پنجاب اور پنجابی زبان سے آشنا نہیں ہیں۔

گربچن سنگھ طالب

پنجابی یونیورسٹی
پٹیالہ
یکم اکتوبر 1973



عنوانات

باب	عنوان	صفحہ
	دیباچہ	3
1	سوانحی خاکہ	11
2	تاتاریوں کے حملے	24
3	خواجہ قطب الدین کی جانشینی	32
4	شیخ فرید کی خلافت کے ابتدائی دور کی کچھ جھلکیاں	44
5	کردار اور تعلیمات	50
6	مریدین اور دائرۂ اثر	62
7	آخری ایام اور وفات	70
8	شیخ فرید بحیثیت شاعر	74
9	مقدس گرنتھ میں شیخ فرید کی بانی	78
10	شیخ فرید کی شاعری — ایک مختصر جائزہ	86
11	تصوف اور اس کی روایات	94
12	تصوف پنجاب میں	110
13	شیخ فرید کا ملتانی پنجابی کلام	117
	کتابیات	156
	نقشہ	28



پہلا باب

سوانحی خاکہ

شیخ فریدؒ[1] (569 — 664 ہجری) جو عام طور پر بابا کے لقب سے مشہور ہیں، ہندوستان کے بڑے درویشوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پنجابی زبان کے بھی وہ پہلے شاعر ہیں، جن کا کلام ہم تک پہنچا ہے۔ اس نسبت سے پنجابی بولنے والوں کو ان کی ذات پر ہمیشہ خصوصیت سے فخر رہا ہے اور صدیوں سے ان کی یاد کو وہ سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ بابا فرید ایک بڑے معلّمِ اخلاق بھی تھے۔ ان کے پیغام کی عالمی شہرت و اہمیت کا راز ان کے کلام کے عارفانہ لب و لہجے میں، برتر حقیقت کے عرفان میں اور اس کی روحانی روشنی میں مضمر ہے۔

بابا فرید کے والد کا نام جمال الدین سلیمان تھا۔ مروجہ روایتوں کے مطابق

---

[1] مسلم صوفیوں اور عالموں کے نام کے ساتھ احترام کے طور پر 'شیخ' کا عموماً اضافہ کیا جاتا ہے۔ گرنتھ صاحب میں بھی اِسی لقب کے ساتھ بابا فرید کا نام لیا گیا ہے، جن کی ذات پیشِ نظر خاکے کا موضوع ہے۔

'شیخ' عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی قبیلے کے "بزرگ" کے ہیں۔ فارسی میں یہ لفظ پیر کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔

ان کے خاندان کے خونی رشتے کابل کے حکم رانوں سے وابستہ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جمال الدین سلیمان کے دادا کابل کے بادشاہ فرخ شاہ عادل کے عزیز تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عمر ابن الخطاب سے ملتا ہے جو پیغمبر اسلام کے دوسرے خلیفہ تھے۔ شیخ فرید کے خاندان نے اپنے آبائی وطن کو، جو وسطی ایشیا میں تھا، منگولوں (تاتاریوں) کی یلغار کے دور میں خیرباد کہا۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔ بہرکیف یہ خاندان کسی ایسی جگہ کی تلاش میں، جہاں اسے پناہ مل سکے اور وہ آباد ہو سکے، پنجاب پہنچا۔ اس وقت پنجاب میں، خصوصاً اس کے اس علاقے میں جو اب پاکستان میں ہے، غزنویوں ہی کے دور حکومت میں مسلمانوں کے متعدد مرکز قائم ہو چکے تھے، اور ان کی خاصی آبادی بھی ہو گئی تھی۔

پنجاب ہی چوں کہ ہندوستان کا ایک ایسا خطّہ تھا، جو مغرب اور شمال مغرب میں مسلمان ملکوں سے بہت قریب تھا، اس لیے اسلام اور اسلامی کلچر نے سب سے پہلے وہیں جڑیں پکڑیں۔ آگے چل کر مسلمانوں کی حکومت جب دہلی میں قائم ہوئی اور شمالی اور وسطی ہند کا علاقہ بھی انھوں نے جلد ہی فتح کر لیا، تو نئے حکم رانوں کے زیرِ نگیں علاقوں میں بھی اسلامی اثرات تیزی سے پھیل گئے۔ دریائے جمنا کے مغرب میں اسلامی اثر و نفوذ کے قدیم مرکز لاہور، ملتان، اوچ، ہانسی، کیتھل، سمنا، سرہند، سونم، پانی پت اور نارنول ہیں۔ دہلی کے علاوہ دوسرے علاقوں میں اجمیر اور بدایوں بھی قدیم ترین مرکز تھے۔

شیخ جمال الدین سلیمان کے گھر میں، رمضان 569 ھ (مطابق 1173ء) میں ایک بچہ پیدا ہوا، جو آگے چل کر ایک بلند پایہ درویش بن کر شیخ فرید کے نام سے مشہور ہونے والا تھا۔ مسلمان اپنے شرعی احکام کے مطابق رمضان کے مہینے میں دن کو روزہ رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نوزائیدہ بچے نے بھی جو

رمضان کے مہینے میں پیدا ہوا تھا' دن کے وقت ماں کی چھاتی سے منھ نہ لگایا۔ اس بچّے کے اور دوسرے کشف وکرامات بھی جو ہم تک پہنچے ہیں' وہ بھی اسی نوع کے ہیں اور جنھیں خوش عقیدہ سوانح نگاروں نے اپنے مرشد کی ملفوظات میں بڑی عقیدت سے قلم بند کیا ہے۔ بہرکیف بچّے کا نام فریدالدین مسعود رکھا گیا۔ اس گھرانے میں پہلے سے صاحبان علم وتقوا موجود تھے' انھوں نے بچّے کا نام فریدالدین عطار کے نام پر فرید رکھا' جو 1119ء میں پیدا ہوئے تھے اور فلسفہ' تصوف پر متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے' جن میں سے ایک ان کی فارسی مثنوی منطق الطیر (چڑیوں کی کانفرنس) بھی ہے۔ اس بچّے کی پیدائش کے وقت وہ خاصے معروف ہو چکے تھے۔ فرید عربی زبان کا لفظ ہے' اس کے معنی یکتا کے ہیں۔ یہ بچّہ بھی فرید کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے نام کے ساتھ شکر گنج' گنج شکر اور پیر شکر بار کے القاب کا بھی اضافہ کیا جانے لگا۔ اس کی تشریح آگے چل کر کی جائے گی۔

شیخ فرید مضافات ملتان کے ایک مقام کھتوال[1] میں پیدا ہوئے۔ اس جگہ کو چاولی مشائخ (خانۂ تقدیس) کہا جاتا ہے۔ مستقبل کے اس درویش کے بچپن ہی میں والد کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا' اور پرورش کے فرایض اس کی ماں قرسوم بی بی نے انجام دیے۔ اس دور کے ملفوظ نگاروں کے بیان کے مطابق یہ خاتون انتہائی نیک دل ہونے کے علاوہ خدا رسیدہ بھی تھیں۔ خود انھوں نے خورد سال فرید کو بنیادی اسلامی عقاید اور اُن فرایض کی تعلیم دی جن کی بجاآوری ہر مسلمان پر فرض ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس بچّے نے

---

[1] مصنف نے اس مقام کا نام Kothwal لکھا ہے۔ سیرالاقطاب میں اس جگہ کا نام کھتی وال لکھا گیا ہے۔ بعض دوسری متداول کتابوں میں کھتوال لکھا ہے۔ (مترجم)

آٹھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا۔ گھر کے ماحول اور بچّے کی خداداد صلاحیت کے پیشِ نظر کم سنی ہی میں اس کا حافظ قرآن بن جانا ناممکنات سے نہیں ہے۔ جوان ہوکر یہ بچّہ صرف درویش ہی نہیں بنا بلکہ مروجہ اسلامی علوم، شرع، فقہ اور فلسفہ و تصوّف میں بھی اس نے دست گاہ حاصل کی۔

گنج شکر کی وجہ تسمیہ، عام روایت کے مطابق یہ تھی کہ بچّے کو نماز کی پابندی کی ترغیب دینے کی نیت سے شیخ فرید کی ماں شکر کی ایک چھوٹی سی پڑیا جانماز میں چھپاکر رکھ دیا کرتی تھیں تاکہ بچّہ یہ سمجھے کہ یہ پڑیا اسے انعام کے طور پر غیب سے ملی ہے۔ ایک بار ان کی ماں مقررہ جگہ پر پڑیا چھپانا بھول گئیں، لیکن یہ بچّے کی خداپرستی اور اس کے حال پر خدا کی مہربانی کا کرشمہ تھا کہ نماز کے وقت مقررہ جگہ پر اسے شکر کی پڑیا مل گئی۔ اس واقعے کو کرامت سے تعبیر کیا گیا اور فرید کو گنج شکر کہا جانے لگا۔

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ جوانی میں شیخ فرید جب انتہائی شدید ریاضت کے دور سے گزر رہے تھے، انھوں نے تین دن کا روزہ رکھا۔ روزہ افطار کرنے کے لیے جب کچھ میسر نہ آیا تو غشی کی سی حالت میں چند سنگریزے انھوں نے منھ میں ڈال لیے، جو خدا کے حکم سے شکر کی ڈلیاں بن گئے، لیکن گنج شکر کی اصل وجہ تسمیہ شیخ فرید کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے اس قول کو سمجھنا چاہیے، جو انھوں نے اُن کے مزاج کی شیرینی کو دیکھ کر کہا تھا کہ "تم شکر کی طرح میٹھے ہوگے۔" شیخ فرید کے پرستاروں اور شاعروں نے ان کے کردار کی اسی شیرینی کو عقیدت مندانہ اشعار کا موضوع بنایا ہے۔ محمد مبارک میر خورد نے سیر الاولیا میں، جو 800ھ کے لگ بھگ لکھی گئی تھی، ایک صوفی شاعر سنائی کا یہ شعر نقل کیا ہے، جس میں شیخ فرید کی روحانی قوت کو خراجِ عقیدت پیش کیا

گیا تھا۔

سنگ در دستِ تو گہر گردد زہر در کامِ تو شکر گردد
(پتھر تمھارے ہاتھ میں گہر اور زہر تمھارے منھ میں شکر بن جاتا ہے)

شیخ فرید کا روحانی سلسلہ

ہندوستان کے مشہور چشتیہ سلسلے کی داغ بیل ڈالنے والوں میں ایک شیخ فرید بھی ہیں۔ یہ چشتیہ سلسلہ بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں شیخ معین الدین چشتی کی آمد کے ساتھ شروع ہوا تھا جو عام طور پر خواجہ غریب نواز کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ وہ رائے پتھورا یا پرتھوی راج چوہان کے عہد میں ہندوستان آئے، جو دلی کا آخری راجپوت فرماں روا تھا۔ اس کی سلطنت اجمیر اور اس کے آگے تک پھیلی تھی۔

چشتیہ سلسلے کے بانی نویں صدی کے ایک عراقی صوفی شیخ اسحاق چشتی تھے۔ شاید ان کے اس قدیم وطن کی مناسبت سے، جو خراسان (ایران) میں تھا، ان کے نام کے ساتھ چشتی کا اضافہ کیا گیا تھا۔ لیکن روحانیت کی منزلیں انھوں نے بغداد میں طے کی تھیں، جو اس دور میں اسلامی علوم و ثقافت اور زہد و تقوا کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق چشتیہ سلسلے کے بانی حضرت علی دیناوری تھے۔

شیخ اسحاق ہی کے روحانی سلسلے سے معین الدین چشتی سجستانی کا بھی تعلق تھا۔ منگولوں نے جب جنوب مغرب کی سمت بڑھنا اور ان علاقوں کو غصب کرنا شروع کیا جہاں ایرانی، ترک اور افغان آباد تھے، تو معین الدین چشتی نے بھی اپنے وطن کو خیرباد کہا۔ چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کے عہد میں

منگولوں کے جوق در جوق حملے ہوتے رہے، جنھوں نے بہت سی سلطنتوں اور تہذیبوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک اس کا سلسلہ جاری رہا اور اس مدت میں بہت سے مسلمان عالموں اور درویشوں نے ان علاقوں سے ہجرت کی۔ منگولوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، اور مختلف شکلوں میں بُدھ مت اور شمانی مذہب کے وہ پیرو تھے۔ اس ہجرت میں مسلمان عالموں اور درویشوں نے جس علاقے کا رُخ کیا وہ پنجاب کا علاقہ تھا جو اس وقت غزنویوں اور ان کے جانشینوں کے زیرِ نگیں تھا، اور انھوں نے اسلامی عقائد و ثقافت کے بہت سے مرکز بھی وہاں قائم کر دیے تھے، اس علاقے کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی خاصی آبادی بھی ہو گئی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد معین الدین سام نے، جو عرفِ عام میں شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہے، جب دہلی پر قبضہ کیا تو مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کی رفتار تیز تر ہو گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان (جسے آج اتر پردیش کہتے ہیں)، راجستھان اور وسطی ہند کے بعض حصوں میں وہ پھیل گئے۔

وسطی ایشیا سے آنے والوں میں خواجہ معین الدین کو، جنھیں احتراماً سلطان العارفین کہا جاتا ہے، اجمیر میں پناہ ملی جہاں پرتھوی راج کی غیر متعصب حکم رانی اور ہندوؤں کی بھاری اکثریت تھی۔ خواجہ معین الدین اور اُن کے مریدوں کے مختصر سے قافلے نے، (جو، کہا جاتا ہے، چالیس افراد پر مشتمل تھا) اجمیر میں سانبھر جھیل کے متصل اپنے خیمے گاڑ دیے۔ ان کے زہد و تقوا اور ان کی خوش خلقی نے مقامی آبادی کو اس درجہ متاثر کیا کہ وہاں کے بسنے والے اپنی مرادیں مانگنے اور آفاتِ ارضی و سماوی سے بچنے کے لیے، ان سے برکتیں حاصل کرنے کی غرض سے اُسی طرح ان کی خدمت میں حاضر

ہونے لگے جس طرح وہ سنتوں اور سادھوؤں کے پاس جاتے تھے ۔ یہ بات اب تک مستند ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکی ہے کہ پرتھوی راج کے عہد تک مقامی آبادی میں سے کسی کو انھوں نے مسلمان بھی کیا تھا یا نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس دور کے حالات پردۂ اخفا میں لپٹے اور تضاد سے لبریز ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پرتھوی راج کی شکست کے بعد اس علاقے کی آبادی نے بڑی تیزی سے اسلام قبول کر لیا۔ خواجہ معین الدین نے اپنے لنگر کے دروازے ہر آنے والے کے لیے کھلے رکھنے کی روایت قائم کی، جس کی پیروی ہندوستان کے دوسرے چشتی صوفیوں نے بھی کی ۔ جاگیردارانہ نظام اور تشدّد کے اس دور میں بھی عام لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور نرم دلی کا برتاؤ کرنے کے لیے وہ مشہور تھے ۔ ان کی درگاہ، جو آج بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے، ہر مظلوم کے لیے جائے پناہ تھی ۔ یہ درویش جسے بھی پناہ میں لے لیتا، اس پر ہاتھ اٹھانے کی کوئی بھی ہمت نہ کرتا، خواہ وہ بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہو۔ اسی بنا پر انھیں غریب نواز کا لقب ملا، اور یہ اصطلاح عام ہو کر ہر اس شخص کے لیے استعمال کی جانے لگی جو انسانی ہمدردی کا رجحان رکھتا ہو۔ خواجہ معین الدین کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ وہ اپنے لیے کچھ بھی بچا کر نہیں رکھتے تھے ۔ ان کی روکھی سوکھی غذا اور اُن کے موٹے جھوٹے کپڑوں کے بارے میں تو بہت سے قصے مشہور ہیں۔

ہندوستان کے مسلم درویشوں میں خواجہ معین الدین چشتی سب سے زیادہ ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ہندوستانی اسلامی زیارت گاہوں میں اجمیر نے، گزشتہ صدیوں میں بھی اپنی برتری قائم رکھی ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ان کے منظوم مناقب کا ایک وسیع ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، جس میں

خواجہ اجمیری کی روحانی عظمت کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے لاکھوں زائرین ہر سال عرس کے موقع پر اس درویش کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ یہ خواجہ اجمیری ہی کا سلسلہ تھا جہاں بیٹے اور وارث تخت و تاج پیدا ہونے کی دعا کرانے کے لیے اکبر برہنہ پا شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، جو شیخ فرید ہی کی اولاد تھے۔ کہا جاتا ہے شیخ سلیم ہی کی دعا سے اکبر کے یہاں بچہ پیدا ہوا جو مستقبل میں جہاں گیر بننے والا تھا اور اس کا نام شیخ سلیم کے نام پر سلیم ہی رکھا گیا۔

شہاب الدین کے سپہ سالار قطب الدین نے، جو ترک اور غلام خاندان کا پہلا فرماں روا تھا، جب دلّی پر قبضہ کیا تو بہت سے مسلمان عالموں اور صوفیوں کو بھی دلّی نے اپنی طرف کھینچا۔ یہاں تک کہ دلّی سمرقند و بخارا کے توام مرکزوں کی ہم سری کرنے لگا۔ ایک متداول تاریخ میں دلّی کو 'قبۃ الاسلام' کہا گیا ہے۔ بڑی بڑی مسجدیں اور خانقاہیں بنیں اور مدرسے قائم کیے گئے۔ خواجہ معین الدین بھی، غالباً اپنے مُریدوں کی دعوت پر دہلی آئے اور اپنے قدیم مرید خواجہ بختیار کاکی اوشی کے پاس قیام کیا، جو دہلی کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنے والے تھے۔ قطب الدین ایبک کو صوفی قطب الدین بختیار کاکی سے گہری عقیدت تھی۔ اس کی تمنا تھی کہ روحانیت کی دنیا کے آفتاب و مہتاب — خواجہ معین الدین اور خواجہ قطب الدین — اس کی راجدھانی میں قیام کریں اور اس کی عزت و شہرت میں چار چاند لگائیں۔ لیکن خواجہ معین الدین اپنے مرکز کی طرف لوٹ گئے، تاکہ ان کے اجمیری معتقدین مایوس نہ ہوں۔ خواجہ معین الدین اور خواجہ قطب الدین کو ایک دوسرے سے جو وابستگی تھی، اُس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خواجہ معین الدین کے ساتھ خواجہ قطب الدین

بھی اجمیر جانا چاہتے تھے، لیکن دلّی کی آبادی اور سلطان قطب الدین نے انھیں دلّی چھوڑنے نہ دیا، اور بڑی منتوں اور سماجتوں کے بعد خواجہ معین الدین نے خواجہ قطب الدین کو دلّی ہی میں رہ جانے کی اجازت دے دی۔ سلطان التمش، جو آگے چل کر دلّی کا بادشاہ ہوا اس نے قطب الدین بختیار کاکی ہی کے اعزاز میں مشہور و معروف قطب مینار دلّی کے قریب مہرولی میں تعمیر کرایا۔

شیخ فرید خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید تھے، ان کی ابتدائی صوفیانہ تربیت و ریاضت سے متعلق جو حالات ملتے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے ہونے والے مرشد سے ان کی پہلی ملاقات ملتان میں ہوئی جہاں دینی علوم کے نصاب کی وہ تکمیل کر رہے تھے۔ منگولوں کے ظلم و تعدی سے محفوظ رہنے کے لیے خواجہ قطب الدین اپنے وسطی ایشیائی وطن سے نکل کر ایک مہاجر کی طرح ملتان پہنچے تھے۔[۵] وہیں خوش شمائل اور سنجیدہ مزاج فرید پر ان کی نظر پڑی، جس کے چہرے سے ذکاوت ٹپک رہی تھی۔ انھوں نے شیخ فرید سے سوال کیا کہ کیا پڑھ رہے ہو، اس کے جواب میں جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ کتاب کا نام "نافع" ہے، جو فقہ کی کتاب ہے، تو خواجہ قطب الدین نے رعایت

---

[۵] قیام ملتان کے دوران خواجہ قطب الدین کو اُن صوفیا کی مزاحمت کا مقابلہ کرنا پڑا جو وہاں پہلے ہی جم چکے تھے۔ ان سب نے خواجہ قطب الدین پر زور دیا کہ ملتان میں وہ قیام نہ کریں۔ ان کے ورود کے شاید چند ہی ماہ بعد ان لوگوں نے ایک دن خواجہ قطب الدین کی جوتیاں اس طرح رکھ دیں کہ ان کا رُخ باہر کی طرف تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس جگہ سے اب انھیں رخصت ہو جانا چاہیے۔ یہ عمل مشائخ بالعموم ایسے مہمانوں کے ساتھ برتا کرتے تھے، جن کا زیادہ قیام میزبان کو گوارا نہیں ہوتا تھا۔

لفظی سے کام لیتے ہوئے کہا "اس سے تمھیں بہت نفع پہنچے گا۔" ان کا یہ جملہ شیخ فرید کے مستقبل کی درویشانہ عظمت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔
ملتان میں خواجہ قطب کے دوران قیام میں وہ دونوں اس درجہ ایک دوسرے کے قریب آگئے، کہ دلّی جاتے وقت خواجہ قطب الدین نے شیخ فرید کو ہدایت کی کہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ بھی دلّی آجائیں۔ انھیں رخصت کرنے کے لیے شیخ فرید کئی منزلوں تک ان کے ساتھ گئے۔ خدا حافظ کہتے ہوئے خواجہ قطب الدین نے ان سے کہا "بابا فرید اب واپس جاؤ اور ملتان میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرو اس کے بعد میرے پاس دلّی آجانا۔" شیخ فرید نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ملتان میں پانچ سال انھوں نے قیام کیا اور مختلف علوم میں کامل دست گاہ حاصل کرنے کے بعد دلّی جاکر خواجہ قطب الدین کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی۔ خواجہ قطب الدین کی قیام گاہ کے متصل ایک جگہ خواجہ فرید کے لیے بھی مخصوص کردی گئی، جہاں ریاضتوں اور مجاہدوں میں وہ لگ گئے، ہر آٹھویں دن وہ اپنے مرشد کی خدمت میں باریاب ہوتے۔[1] آگے چل کر شیخ فرید نے ہانسی میں بھی کئی سال قیام کیا اور وہاں لوگوں کو صوفیانہ زہد و تقوا کی تعلیم دیتے رہے۔ ہانسی میں انھوں نے اپنا ایک مرکز بھی قائم کیا، جس کے باقیات آج بھی موجود ہیں۔

خواجہ قطب الدین کے مرشد خواجہ معین الدین جب ان کے پاس دلّی پہنچے، تو خواجہ فرید اپنے مرشد کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ نفس کو زیر کرنے اور روح کو منوّر کرنے کے لیے چشتیہ طریق کے مطابق ریاضت

---

[1] بہ حوالہ سیر الاولیا

شاقہ میں اور مسلسل عبادت میں مشغول رہنا ضروری ہے۔ اسی ضمن میں ایک ریاضت کو چلّہ معکوس کہتے ہیں۔ اس چلّے کے دوران اُلٹے (سر کے بل) لٹک کر عبادت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ریاضت، جو بھیانک حد تک کٹھن ہوتی ہے، ان لوگوں کے لیے تجویز کی جاتی ہے جو درویشی کی اعلا منزلیں طے کر چکے ہوتے ہیں اس چلّے کی تکمیل کے بعد صوفی کو قطب کا درجہ حاصل ہوتا ہے جو اسلامی تصوف میں ایک اعلا مرتبہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کسی سنسان مقام پر جہاں انسانوں کا گزر نہ ہوتا ہو ریاضت کرنے والے کو چالیس دن تک رسّی باندھ کر ہر روز صبح کو کنوئیں میں اُلٹا لٹکایا جاتا ہے اور غروبِ آفتاب کے بعد اسے باہر نکالا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں اُسے دن کو روزہ رکھنا ہوتا ہے اور رات کو باہر نکلنے کے بعد غذا کی طرف زیادہ رغبت نہیں ہو سکتی[ف]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاضت کے دوران میں خواجہ معین الدین اور خواجہ قطب الدین شیخ فرید کے پاس آئے اور ان دونوں نے ان کی نفس کشی کو اور اس داخلی روشنی کو دیکھا جس نے ان کے دل و دماغ کو منوّر کیا تھا۔ اس موقع پر خواجہ معین الدین نے جو کچھ کہا وہ محبت اور توصیف کے جذبات سے لبریز ہے اور مشہور و معروف کتاب سیر الاقطاب میں درج ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے مطابق:

"کہا جاتا ہے کہ سلطان العارفین خواجہ معین الدین حسن سنجری

[ف] اس جگہ مصنّف سے سہو ہوا ہے۔ یہ ریاضت دن کو نہیں رات کو کی جاتی ہے عشا کی نماز کے بعد کنوئیں میں لٹکایا جاتا ہے اور طلوعِ آفتاب سے قبل کنوئیں سے نکالا جاتا ہے۔ (مترجم)

قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز جب اجمیر سے دلی تشریف لائے تو قطب الاقطاب نے اپنے مریدوں کو ان کی خدمت میں پیش کیا۔ ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی لیاقت کے مطابق روحانی انعام سے سرفراز ہوا۔ اس کے بعد سلطان العارفین نے دریافت کیا کہ 'بابا قطب الدین تمھارے مریدین میں کوئی باقی تو نہیں رہا' انھوں نے جواب میں کہا کہ 'مسعود نامی ایک فقیر چلے میں بیٹھا ہے' (اسی وجہ سے وہ حاضر نہیں ہوسکا ہے)۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے اس مرید کے حالات بھی بیان کیے جسے سن کر سلطان العارفین کھڑے ہوگئے اور کہا آؤ چلو اسے دیکھیں۔ اس کے بعد دونوں بزرگوار صاحب اسرار اس رکنِ روزگار کے حجرے پر آئے اور دروازہ کھولا۔ حضرت شکر گنج اس درجہ کمزور ہوچکے تھے کہ ان کی تعظیم کے لیے وہ کھڑے نہ ہوسکے۔ ناچار آبدیدہ ہوکر ان کے قدموں میں گر پڑے۔ ان کی حالت دیکھ کر سلطان العارفین نے فرمایا کہ اس بیچارے کو تم کب تک مجاہدے میں مبتلا رکھو گے! آؤ ہم اور تم مل کر اسے کچھ عطا کریں۔ چناں چہ دونوں نے شیخ فرید کے ایک ایک بازو کو پکڑ کر کھڑا کیا' اور سلطان العارفین نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا کہ اے جل جلالہٗ شیخ فرید کو قبول کر اور درویشی کے اعلا مراتب اسے عطا کر' اس کے جواب میں غیب سے آواز آئی کہ فرید کو میں نے قبول کیا اور وہ فریدِ دہر اور وحیدِ عصر ہوگا' یہ آواز سنتے ہی شیخ فرید پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ دیکھ کر حضرت خواجہ (قطب الدین) نے وہ اسم اعظم پڑھا

جو بزرگان چشت کو سینہ بسینہ منتقل ہوا تھا۔ شیخ فرید کا سینہ منوّر ہوگیا اور ان کے اور خدائے عز وجل کے درمیان کوئی حجاب باقی نہ رہا۔ اس کے بعد سلطان العارفین نے انھیں خلعت خاص مرحمت فرمائی اور قطب الاقطاب نے انھیں دستار اور دوسری چیزیں عطا کیں، جو لازمۂ خلافت ہیں۔ اس موقع پر ایک شاعر نے، جو وہاں موجود تھا، ان کی مدح میں فی البدیہہ یہ شعر کہا:

"فرید کو دو بزرگوں سے دونوں جہاں کی دولت حاصل ہوئی
"بادشاہانِ جہاں سے انھیں بادشاہی کا مرتبہ ملا"[1]

"اس کے بعد حضرت سلطان العارفین نے خوش ہوکر فرمایا 'بابا قطب الدین کے جال میں بہت بڑا شاہین پھنسا ہے جو سدرۃ المنتہیٰ کے علاوہ اور کہیں اپنا آشیانہ نہیں بنا سکتا'۔"

---

[1] فارسی شعر جو سیر الاقطاب میں درج ہے، یہ ہے:
بخشش کونین از شیخین بگرفتہ فرید
بادشاہی یافتہ از بادشاہانِ جہاں
(مترجم)

دوسرا باب

تاتاریوں کے حملے

ایران کی تاریخ میں بارھویں صدی عیسوی منگولوں یا تاتاریوں کے حملے کی صدی ہے۔ یہ تاتاری، جو شمالی ترکستان کے رہنے والے خانہ بدوشوں کی نسل سے تھے، ان مسلم ملکوں پر چڑھ دوڑے جو صدیوں سے بڑے بڑے شہری مرکزوں اور بڑی بڑی تہذیبوں کا گہوارہ رہے تھے۔ اس وقت تک ان تاتاریوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ترکی و ایران کی دولت کی طمع میں وہ اپنی نیم وحشی فوجوں[1] کو لے کر ان ملکوں پر بار بار حملے کرتے رہے۔ پھر ان کی یلغاریں غزنی و ہرات تک پہنچیں اور وہاں کے بسنے والوں کو ہتھیار ڈالنے یا ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان تاتاریوں نے وہاں کے مردوں اور عورتوں کو یا تو تہ تیغ کیا یا غلام بنایا اور بے انتہا مال و دولت اپنے ساتھ لے گئے۔ تاتاریوں کے ان حملوں کو جن کا سلسلہ ایک صدی تک جاری رہا اور جن کے دوران میں ترکستان سے لے کر بغداد تک تمام اسلامی

---

[1] تاتاری اپنی فوج کے لیے "اُردو" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ انگریزی میں یہی لفظ Horde بن گیا، جو بربریت کے ہم معنیٰ ہے۔

ملکوں کو انھوں نے بار بار تاراج کیا، انھیں سائکس (Sykes) نے اپنی تاریخ ایران (History Of Persia) میں 'اختلالِ عظیم' سے تعبیر کیا ہے۔ ان حملوں کے دوران ایک بڑے وسیع پیمانے پر جو تباہی و بربادی رونما ہوئی، اس پر اختلال عظیم ہی کی اصطلاح صادق آتی ہے۔ ان نیم وحشی خانہ بدوشوں نے ایک دنیا ہی کو نہیں، ایک پورے تمدن کو تخت و تاراج کیا اور ملکوں کو خاک سیاہ کر ڈالا۔ اسلامی دنیا کے دارالخلافہ پر انھوں نے قبضہ کیا اور بہیمانہ توہم پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آخری عباسی حکمراں خلیفہ مستعصم باللہ کو ہلاک کر دیا۔ ان واقعات کو فارسی کے قدیم مورخوں نے چنگیز خاں کے بارھویں صدی کے حملوں کی تاریخ سے کچھ حد تک خلط ملط کیا ہے۔ چنگیز خاں، جو تاتاری سرداروں میں سب سے زیادہ مشہور ہوا ہے، 1162ء میں پیدا ہوا تھا۔ 1175ء میں اس نے عنان قیادت سنبھالی اور اپنی وفات، 1227ء تک تباہی و بربادی کا اپنا پیشہ جاری رکھا۔

شیخ فرید جس دور (1173 - 1265ء) میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے، عالم اسلام کے انحطاط کا، بلکہ ایک تمدن کی مکمل تباہی ——— اندوہناک تباہی ——— کا عہد تھا۔ فارسی شاعر سعدی نے ایک دردناک مرثیے میں اس دور کی داستان کو نظم کیا ہے، جو بغداد پر تاتاریوں کے قبضے اور خلیفہ مستعصم کی شہادت پر لکھا گیا تھا۔ خلیفہ مستعصم کی ذات میں دو حیثیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ امیر المومنین کے شاہی رتبے کے ساتھ ساتھ نائب پیغمبر ہونے کا تقدس بھی اُسے حاصل تھا۔ دنیا کو ہلا دینے والا مستعصم کی شہادت کا واقعہ 656ھ (1258ء) میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں پیش آیا، جو چنگیز خاں کا پوتا اور ایران کے دوسرے خان خاندان کی حکومت کا بانی تھا۔ اسلامی دنیا پر تاتاریوں

کے ایک صدی کے مسلسل حملوں نے مسلمانوں کی پیہم ملک گیری اور اس کے استحکام کے عمل کو، جو اپنی ترقی کی ساتویں صدی میں داخل ہو چکا تھا، پہلا شدید دھکا لگایا، اور یہ ان کی ترقی کے تسلسل کو درہم برہم کرنے والا عظیم سانحہ تھا۔ بغداد کی تاراجی اور اس کے بھیانک نتائج نے تباہی کے عمل کو اس اعتبار سے نقطۂ عروج پر پہنچادیا کہ اسلامی دنیا میں بغداد کو وہی علامتی حیثیت حاصل تھی جو عیسائی دنیا میں روم کی تھی۔ بغداد کی تباہی کے اس پہلو نے دنیا کے صاحبِ فکر مسلمانوں میں المناک اور یاس انگیز جذبات پیدا کیے۔ سعدی کے جس مرثیے کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کے ابتدائی اشعار میں نوحہ خوانی کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

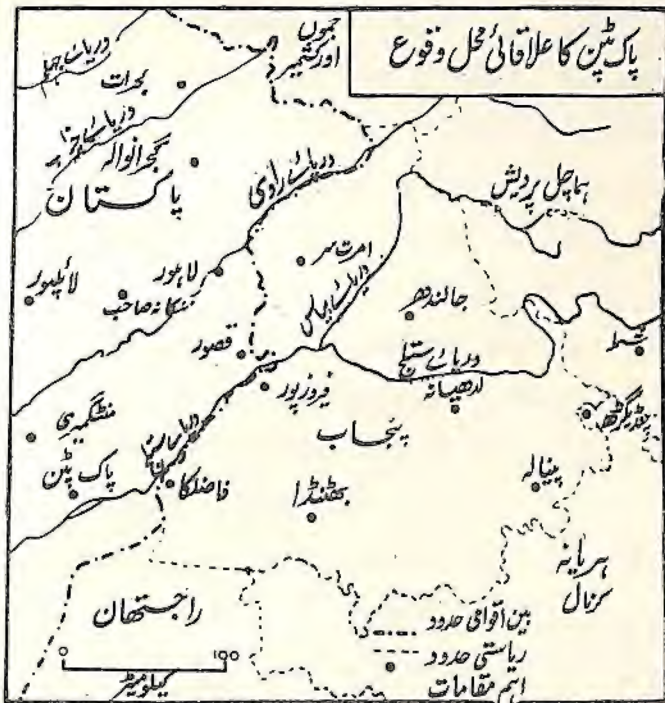
"امیر المومنین ملک مستعصم کے زوال پر آسمان کو بھی خون بہانے کا حق ہے۔ اے محمد اگر یہ سچ ہے کہ قیامت کے دن تم قبر سے اٹھوگے تو سر اٹھا کر دیکھو کہ انسانیت پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔"

تاتاریوں کی فتوحات کا بیان، یا چنگیز کے بے شمار حملوں کی تاریخ دہرانا اس چھوٹی سی کتاب کے مقصد اور اس کے حدود سے باہر ہے۔ ان ہی حملوں کے دوران بخارا کے بہادر مسلمان حکمران جلال الدین خوارزم شاہ کا پیچھا کرتا ہوا چنگیز خاں ہندوستان میں سندھ اور ملتان تک پہنچا۔ خوارزم شاہ نے بھی آخری دم تک اس کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا تھا۔ چنگیز خاں نے اگرچہ ہندوستان میں آگے بڑھنا (1221ء) مناسب نہیں سمجھا، تاہم تاتاریوں کی ہیبت نے دلّی کی سلطنت کو لرزہ براندام کر دیا تھا، جس کے کچھ دور دراز صوبے تاتاریوں کے غیظ و غضب کا شکار ہو رہے تھے۔ یہ اس وقت کا قصہ ہے جب کہ شیخ فرید کو ملتان سے متصل اجودھن کے مقام پر قیام پذیر ہوئے

خاصی مدت گزر چکی تھی، جہاں وہ نیم مہذب قبائلیوں میں خدا پرستی کے پرچار کی اہم خدمت انجام دے رہے تھے۔

بارھویں صدی عیسوی کے حالات سے متعلق، نیز تاتاریوں کے قبل چنگیز کے عہد کے کوائف کے سلسلے میں (اگرچہ واقعات گڈمڈ ہیں، تاہم) متعدد مقامات پر منگولوں کا اور اُن نسبتاً غیر مؤثر جنگوں کا ذکر ملتا ہے، جو مسلمان حکم رانوں نے ان کے خلاف لڑی تھیں۔ یہی کوائف مسلم علما و صوفیا کے ہجرت کرنے اور ہندوستان آنے کے پس منظر کا مواد فراہم کرتے ہیں۔ شیخ فرید کے پردادا کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کسی جنگ یا کسی حملے کے دوران مارے گئے تھے۔ یہ واقعہ غزنی میں پیش آیا تھا، جہاں کے حکم راں خاندان سے اُن کا بھی تعلق تھا اور اسی واقعے نے ان کے خاندان کو ہندوستان کے اس علاقے میں پناہ لینے پر مجبور کیا، جو پنجاب میں ملتان کے گرد و نواح میں تھا اور جہاں غزنویوں کی عمل داری تھی۔

منگولوں نے، چنگیز خاں کے اس حملے سے قبل، جو 1221ء کے لگ بھگ ہوا تھا، اوچ اور سندھ کے صوبے دار نصیر الدین قباچہ کو زچ کیا تھا۔ یہ شیخ فرید کے عہد شباب کا قصہ تھا۔ اس مصیبت کے وقت قباچہ کی نظریں مقدس بزرگ خواجہ بختیار کاکی کی طرف اُٹھیں۔ قباچہ کو انھوں نے ایک پھنکا ہوا تیر دے کر کہا کہ منگولوں کی فوج کی طرف چلا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی تاتاری فوج پسپا ہو جائے گی۔ اور یہی ہوا۔ اس تیر کے چلتے ہی منگولوں کی فوج پر تیروں کی ایسی بارش شروع ہوئی اور اُن کے مورچوں پر ایسا دھاوا ہوا کہ انھیں محاصرہ اُٹھاتے ہی بنی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ذی اقتدار سلطان التمش کے عہد میں پیش آیا تھا۔ قباچہ التمش


پاک پتن کا علاقائی محل وقوع
جموں اور کشمیر
دریائے جہلم
گجرات
دریائے چناب
گوجرانوالہ
پاکستان
دریائے راوی
ہماچل پردیش
امرتسر
لاہور
لائلپور
ننکانہ صاحب
دریائے بیاس
جالندھر
قصور
دریائے ستلج
لدھیانہ
فیروزپور
منٹگمری
پنجاب
پاک پتن
فاضلکا
بھٹنڈا
پٹیالہ
ہریانہ
کرنال
راجستھان
بین الاقوامی حدود
ریاستی حدود
اہم مقامات
کیلومیٹر

ہی کا صوبے دار تھا، جسے منگولوں نے ہراساں کیا تھا۔ منگولوں نے اس واقعے سے بھی پہلے، مشہور فارسی شاعر فریدالدین عطار (ولادت 1119ء) کی زندگی میں نیشاپور پر حملہ کیا تھا، جو بہت سے فارسی شاعروں کی جنم بھومی کی حیثیت سے مشہور ہے۔ براؤن نے "تاریخ ادبیاتِ ایران (Literary History of Persia) میں اسی دور کے ایک فارسی شاعر نجم الدین کبرا کی یہ رباعی نقل کی ہے، جس میں بے دین تاتاریوں سے ایرانی مسلمانوں کے جنگ آزما ہونے کے بے باکانہ عزم کا اظہار کیا گیا تھا:

'ہم امیروں کی نسل سے ہیں، جو جام بکف رہتی ہے۔
ہم مفلس نہیں ہیں جو بکروں کی کھالوں پر زندگی گزارتے ہیں۔
ہمارے ایک ہاتھ میں ایمانی شراب کا جام ہوتا ہے
اور دوسرے ہاتھ سے بے دینوں کے نشان ہم چھین لیتے ہیں'

ہمیں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ملتان اور اوچ کے حکمراں شیر خاں نے بھی شیخ فرید کو پریشان کرنے کی کوشش کی تھی[1] لیکن اس کے اسباب کا ہمیں پتہ نہیں چلتا۔ ہو سکتا ہے کہ مشائخ کی بین المسلکی آویزش یا متشدد علما کی سازش اس کی پشت پر کارفرما رہی ہو۔ بہرکیف شیخ فرید نے صبر و تحمل کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شیر خاں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا اور سال ہی بھر کے اندر بے دین (تاتاریوں) نے اس کے علاقے پر دھاوا بول دیا۔

سلطان بلبن کے عہد میں تاتاریوں نے (1285ء) میں پھر پنجاب

---

[1] فوائدالفواد (فارسی)، جو شیخ نظام الدین اولیا کی مرقوم گفتگو کہی جاتی ہے۔

پرحملہ کیا، جو سلطنت دلی کا ایک دور افتادہ صوبہ تھا۔ ملتان کے قریب گھسان کا رن پڑا، جس میں دلی کی فوجوں کو شکست ہوئی اور سلطان کا بیٹا شاہزادہ محمد بھی اس لڑائی میں کام آیا اور شہید کہلایا۔ اس صدمے نے سلطان بلبن کا دل توڑ دیا اور وہ بھی جلد ہی اس دنیا سے گزر گیا۔ اس سانحے پر امیر خسرو نے ایک مرثیہ لکھا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ اس مرثیے میں پہلی بار اس علاقے کا نام پنجاب لکھا گیا ہے۔ اسی جنگ میں شیخ فرید کا ایک لڑکا بھی کام آیا، جو سلطان کی فوج میں افسر تھا۔ امیر خسرو بھی اس جنگ میں شاہزادہ محمد کے ہم رکاب تھے اور وہ بھی منگولوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ اپنی اس مصیبت کا ذکر انھوں نے اس شعر میں کیا ہے:

من کہ بر سر نمی نہادم گل　　　بار بر سر نہاد و گفتا چل

(میں، جس نے کہ سر پر پھول کا بوجھ بھی کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ میرے سر پر منگولوں نے بوجھ لاد کر کہا، چل)

سیر الاولیا جو 800ھ (1400ء) کے لگ بھگ لکھی گئی تھی، اس میں منگولوں کی ہیبت کی ایک دوسری جھلک نظر آتی ہے۔ فیروز شاہ تغلق (1352-1388ء) کو امرا نے تخت نشین کیا۔ ان کا خیال تھا کہ منگولوں کی یلغاروں کو صرف وہی روک سکتا ہے۔ اس سے قبل فیروز شاہ تغلق کے پیش رو محمد تغلق کو چغتائی منگولوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دارالخلافہ کو دلی سے دیوگری منتقل کرنے کا جو ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ محمد تغلق نے کیا تھا، اس کی پشت پر جو محرکات کارفرما تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس طرح سے منگولوں کے حملوں سے نجات مل جائے گی۔ منگولوں کی جو ہیبت دلوں میں بیٹھ گئی تھی، پنجابیوں کے نسلی تحت الشعور میں وہ آج بھی چھپی ہے۔ چناں چہ پنجابی زبان میں بہائم صفت

انسان کو اجتخ یا ازبک کہا جاتا ہے، جو اس دور کی یاد دلاتا ہے، جب وسطی ایشیا کے ازبک، جو منگولوں ہی کے ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، لوگوں کے لیے ہیبت کا نشان بن گئے تھے۔

ان واقعات پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ منگولوں نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنا شروع کیا اور اسلامی کلچر کو نیست و نابود کرنے والے منگول آگے آنے والی صدیوں میں مکافاتِ عمل کے طور پر، اسلام کی بقا اور اس کے تحفظ کا زبردست ذریعہ بن گئے۔ تیمور لنگ جو چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اگرچہ قتل و غارت کا ایک طوفان لے کر نمودار ہوا، تاہم اپنے فاتحانہ عمل کو اس نے اسلام ہی کے نام پر سرانجام دیا۔ بابر بھی تیمور ہی کی اولاد تھا جس نے ہندوستان کے شاہی خاندانوں کی فہرست میں اس مغل خاندان کا اضافہ کیا جو دنیا کی تاریخ میں ایک انتہائی شان دار مسلم حکم ران خاندان تھا، اور جس نے اپنے پیچھے انتظامی روایات کا اور فن کارانہ کارناموں کا ایک خزانہ چھوڑا۔ منگولوں کے قبول اسلام ہی پر اقبال نے یہ مصرعہ کہا تھا:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

تیسرا باب

خواجہ قطب الدین کی جانشینی

مریدی و شاگردی کے ابتدائی دور میں بھی شیخ فرید کو اپنے مرشد خواجہ قطب الدین سے انتہائی عقیدت تھی اور صوفیا کی روایات کے مطابق ان کے احکام کی وہ بے چون و چرا تعمیل کرتے تھے۔ تصوف کا ایک مسلّمہ اصول شیخ یا روحانی معلم کی اطاعت بھی ہے، جسے اندھی اطاعت ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ہم پایہ مثال ہندوستان کی بھگتی تحریک ہی میں ملتی ہے۔

شیخ فرید کی مرشد پرستی کے بعض عجیب و غریب قصے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب دلّی میں خواجہ قطب الدین سے وہ روحانی تربیت حاصل کر رہے تھے تو جاڑوں میں ایک دن اپنے مرشد کے غسل کے لیے اُنھیں پانی گرم کرنا تھا۔ چولھا جلانے کے لیے گھر میں آگ نہیں تھی۔ آگ کی تلاش میں گھر سے نکل کر ایک دروازے پر پہنچے جو کھلا ہوا تھا۔ اس گھر کی صاحب خانہ اس حسین درویش پر فریفتہ ہو گئی اور اُسی طرح اپنے دام میں گرفتار کرنے کی کوشش کی جس طرح زلیخا نے حضرت یوسف کے ساتھ کیا تھا۔ یہ پارسا نوجوان اس عورت کے جال میں پھنسا تو نہیں، لیکن آگ کی ایک چنگاری

حاصل کرنے کے لیے اسے اپنی ایک آنکھ اس نامراد عورت کی نذر کرنی پڑی۔ جب مرشد کو اپنے مرید کی آنکھ کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے خدا سے دعا مانگی کہ ان کے مرید کی کھوئی ہوئی آنکھ اسے دوبارہ مل جائے' اور ان کی یہ دعا قبول ہوئی۔

شیخ فرید نے طویل مدت تک ہانسی کے مقام پر قیام کیا اور لوگوں کی درخواست پر وہاں ایک خانقاہ بھی قائم کی۔ ان کے ایک مخلص مرید شیخ جمال الدین نے اس خانقاہ میں شیخ فرید کی قائم کردہ روایات کو برقرار رکھا۔ یہ مرکز آج بھی ہانسی میں موجود ہے۔ اسی خانقاہ میں شیخ فرید عوام الناس کو حق پرستی کا درس دیا کرتے تھے۔ جب کبھی شیخ فرید دلی جاتے' جہاں ان کے مرشد قطب الدین کو قطب وقت کا مرتبہ حاصل تھا' تو ان کے وہ معتقدین ان کی کمی بڑی شدت سے محسوس کرتے جو ہانسی اور اس کے نواحی دیہاتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ سرہنگ نامی ایک شخص کی گریہ وزاری نے شیخ فرید کو صد درجہ متاثر کیا تھا' جس نے اُن کے قدموں پر گر کر درخواست کی تھی کہ اپنا دلی جانا وہ کم کر دیں تاکہ اُن کے پرستار زیادہ عرصے تک اُن کے دیدار سے اور اُن کی دعاؤں کی برکتوں سے محروم نہ رہا کریں۔ اس واقعے کے بعد شیخ فرید نے ہانسی کو خیرباد کہہ دیا۔

شیخ فرید جب آخری بار دلی سے روانہ ہونے والے تھے تو اُن کے مرشد خواجہ قطب الدین کو کشف ہوا کہ اس دنیا سے اُن کے رخصت ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ انھوں نے آب دیدہ ہو کر اپنے محبوب مرید سے کہا "فریدالدین مجھے معلوم ہے کہ میری زندگی کے آخر لمحوں میں تم میرے پاس نہیں ہو گے کیوں کہ مشیت ایزدی یہی ہے۔ میرے مرنے کے دو تین

دن بعد ہی تم یہاں آسکو گے۔" اس کے بعد انھوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور اپنے مرید کو رخصت کرتے ہوئے کہا "تمھاری امانت میں قاضی حمید الدین کے حوالے کردوں گا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اُن سے لے لینا۔" اس گفتگو کے بعد شیخ فرید ہانسی واپس گئے اور خاصی مدت تک وہیں مقیم رہے۔ قطب الاقطاب نے جس دن رحلت کی اسی رات کو شیخ فرید نے خواب دیکھا کہ خواجہ قطب الدین انھیں طلب کر رہے ہیں۔ وہ فوراً دلّی کی طرف چل پڑے اور تیسرے دن دلّی پہنچے اور دست گیری کرنے والے اپنے مرشد کے مزار کی زیارت کی۔ مرشد کا پیوند لگا خرقہ اور دوسرا ساماں[1] انھیں مل گیا جو قاضی حمید الدین کے حوالے کیا گیا تھا۔ قاضی (حمید الدین) نے یہ بھی انھیں بتایا کہ خواجہ (قطب الدین) نے اس مقام (دلّی کی خانقاہ) کو آپ کے خادموں (قاضی حمید الدین) کے سپرد کیا ہے۔[2]

تین دن دلّی میں گزار کر چوتھے روز نماز فجر کے بعد شیخ فرید ہانسی کی طرف چل پڑے۔ اہالیانِ دلّی نے ان سے التجا کی کہ دلّی ہی میں وہ قیام کریں۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ "مرشد نے جو کچھ مجھے عطا کیا ہے، میں جہاں بھی رہوں، وہی میرا ہے۔" اس کے بعد شیخ فرید ہانسی آگئے اور وہاں انھیں بے حد شہرت اور بے حساب لوگوں کی عقیدت حاصل ہوئی۔

خواجہ قطب الدین نے 635ھ (تقریباً 1240ء) میں اس سرائے فانی سے رحلت کی۔ اپنے مرشد خواجہ معین الدین کے حکم سے انھوں نے دلّی میں

---

[1] نعلین، عصا اور دوسری نشانیاں۔

[2] بحوالہ سیر الاقطاب

صوفیانہ تقدس کے جو اعلا آثار چھوڑے ہیں ان میں مشہورِ روزگار قطب مینار کے علاوہ ان کے مرید نظام الدین اولیا کا مزار اور ان گنت علما و فضلا ہیں جو اس شہر نے گذشتہ آٹھ صدیوں میں پیدا کیے ہیں۔

چشتی صوفیا کی روایات کے مطابق خواجہ قطب الدین نے، اور ان کے مرشد نے بھی، کوئی کتاب (ملفوظات) نہیں چھوڑی لیکن ان کی گفتگو، جو قلم بند کرلی گئی تھی، نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہی۔ خواجہ معین الدین نے اپنے مرید کو بتایا تھا کہ حقیقی صوفی تین صفات سے متصف ہوتا ہے — خوف، رضا اور محبت۔ ان میں سے پہلی صفت کا مقصد ترکِ گناہ ہے، تاکہ آتشِ دوزخ سے محفوظ رہے۔ رضا کا تعلق محبتِ الٰہی سے ہے یعنی خدا کے سوا اور کسی چیز کو بقا نہیں ہے۔ چنانچہ نقاشِ صورتِ موجودات نے ہر صفحے پر آیۂ قرآنی ثبت کردی ہے کہ خدا کے سوا باقی تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی۔

رحلت سے قبل خواجہ قطب الدین کے مرشد نے جو اور نصیحتیں انھیں کی تھیں، یہ ہیں:

"تصوف کی یہ نشانیاں، جو میں تمھیں ودیعت کر رہا ہوں، ایک امانت ہے جو ہمارے بزرگوں کو سینہ بہ سینہ خود رسول اللہ سے منتقل ہوتی رہی ہے۔ میں اس امانت سے سبک دوش ہوتا ہوں۔ اب اس سے عہدہ برآ ہونا تمھاری ذمّے داری ہے۔ اس فرض کو تم اس طرح انجام دو کہ عاقبت میں تمھیں پشیمانی نہ ہو۔ اے میرے عزیز بیٹے! خدا کے روشن ضمیر بندے سورج کے مانند چمکتے ہیں۔ یہ لوگ نورِ معرفت سے سارے عالم کو

منوّر کرتے ہیں۔ اہلِ محبت کا جو مقام ہے، وہ فرشتوں
کو بھی حاصل نہیں ہے۔ چار صفتیں انسان کو قیدِ
نفس سے نجات دلاتی ہیں: اوّل درویشی میں بھی تونگری
کی شان ہو، دوم گرسنگی کی حالت میں بھی شکم سیر نظر
آئے، سوم غم و اندوہ کی حالت میں بھی شادماں
رہے، چہارم خلق جتنی بُرائی سے پیش آئے، اسی کے
برابر اس کے ساتھ نیکی کی جائے۔"[1]

خواجہ قطب الدین کو جو تعلیم اپنے مرشد سے ملی تھی، اُسے انھوں نے اپنے مریدِ خاص کو، اور ان کی وساطت سے عالمِ انسانیت کو، ودیعت کی۔ ان کی رحلت کا دن لاکھوں انسانوں کے لیے غم والم کا دن تھا۔ وفات سے قبل ہی انھوں نے اپنی قبر کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ جب موت آئی تو اس شعر پر انھیں وجد کی کیفیت طاری ہوئی، جس میں عشقِ الٰہی کی وہ لذت آمیز اذیت پنہاں تھی جو شہادت کی بے پایاں مسرت کے مماثل ہے۔

تشنگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست
(تشنگانِ رضائے الٰہی کو ہر لمحہ غیب سے ایک نئی جان ملتی ہے)[2]

---

[1] مبنی بر سیر الاقطاب

[2] یہی شعر اس طرح بھی مشہور ہے اور اکثر صوفیا کی وفات سے وابستہ ہے:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

خواجہ قطب الدین کے جنازے کے ساتھ خلقت کا ہجوم تھا۔ سلطان التمش اور عمائدین بھی ساتھ ساتھ تھے۔ ان کے بعض معتقدین نے محسوس کیا کہ ان کے مزار سے یہ صدا آرہی ہے:

مرا زندہ پندار چوں خویشتن من آیم بجاں، گر تو آئی بہ تن

(مجھے بھی اپنے ہی طرح زندہ سمجھو، اگر تم اپنا جسم لے کر میری طرف بڑھو گے تو میں روح بن کر تمھارا استقبال کروں گا)۔

اپنے مرشد کے ساتھ شیخ فرید کی عقیدت مندی، جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے، مثالی تھی۔ خواجہ قطب الدین سے انھیں جو عقیدت تھی، اسے کسی شاعر نے مندرجہ ذیل رباعی میں نظم کیا ہے، جسے نظام الدین اولیا کے مرید شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے اپنی کتاب خیر المجالس میں نقل کیا ہے:

مقبولِ تو جز مقبلِ جاوید نشد وز لطفِ تو ہیچ بندہ نومید نشد

عزت بکدام ذرہ پیوست پے کاں ذرہ بہ از ہزار خورشید نشد

(جو بندہ تمھارا مقبول ہوا، اسے مقبولیت جاوید حاصل ہوئی۔ تمھاری مہربانی سے کبھی کوئی شخص مایوس نہیں ہوا، جس ذرّے کو تم نے عزت بخشی وہ ذرّہ ہزاروں آفتاب سے زیادہ روشن ہوا)

شیخ فرید نے، عقیدت مندوں کے ہجوم سے تنگ آکر، ہانسی کو خیرباد کہا اور اجودھن میں اقامت اختیار کی۔ یہ جگہ سنسان ہونے کی وجہ سے انھیں بے حد پسند آئی۔ یہاں ان کی ریاضت وعبادت میں مخل ہونے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن یہاں بھی جلد ہی قرب وجوار کے ذی اثر لوگ ان کے گرویدہ ہوکر ان کے مریدین کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ ارادت مندوں کا ہجوم ان کی زیارت کے لیے جب یہاں بھی جمع ہونے لگا، تو اس جگہ کو بھی

چھوڑنے کا انھوں نے قصد کیا، لیکن اِن کا یہ ارادہ عمل میں نہ آسکا، کیوں کہ ان کے مرشد نے اسی جگہ قیام کرنے کا انھیں حکم دیا تھا۔ بہر کیف اجودھن ہی میں انھوں نے سکونت اختیار کرلی۔ ایک دن سلطان غیاث الدین بلبن ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے ساتھ، قدرتی طور پر، ایک ہجوم بھی تھا، جسے دیکھ کر شیخ فرید کچھ کبیدہ خاطر ہوئے۔ اسی وقت غیب سے آواز آئی کہ "اے شیخ! مجمع کو دیکھ کر تم کبیدہ خاطر نہ ہو۔ لوگوں کے شور و شغب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرو۔" اس دن کے بعد انھوں نے کسی آنے والے کو روکا نہیں اور سب کچھ صبر و تحمل سے انگیز کیا۔[1]

ایک فارسی کتاب میں شیخ فرید کے ابتدائی حالات ملتے ہیں۔ اس میں ان کے دلّی کے متعدد سفروں کے حالات، ہانسی کے مقام پر۔ جو دارالخلافہ دلّی سے کوئی سو میل کے فاصلے پر ہے۔ مختلف اوقات میں ان کے طویل قیام کی کیفیت اور اس اجمیر کے سفر کے حالات درج ہیں جو ہندستان میں چشتی سلسلے کے بانی خواجہ معین الدین کا مستقر رہا تھا۔ اس کتاب سے شیخ فرید کے مختلف سفر و سیاحت کی صحیح تاریخوں کا اگرچہ پتہ نہیں چلتا، تاہم بنیادی واقعات کا جہاں تک تعلق ہے وہ شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ شیخ فرید دلّی میں ایک چلّہ کشی (چالیس روزہ ریاضت) کر چکے تھے، تاہم اجمیر کی روایات کے مطابق وہاں بھی انھوں نے چلّہ کشی کی، اگرچہ اس کی انھیں کوئی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ وہ ایک شدید ترین چلّہ پورا کر چکے تھے اور دو درویشوں — خواجہ معین الدین اور خواجہ قطب — سے برکت اور

---

[1] فوائد الفواد

سند حاصل کر چکے تھے۔ اب وہ شیخ تھے اور تعلیم و تربیت کا مرکز قائم کرنے کے مجاز بھی۔

ابتدائی دور کے صوفی انتہائی متقی ہوتے تھے اور مرتاضانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ادنا عیش و آرام بھی اپنے اوپر حرام سمجھتے اور صاحبان ثروت و اقتدار سے دور رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہانسی کے دوران قیام میں بھی، جو دلی سے زیادہ دور نہیں ہے۔

شیخ فرید کی خواہش تھی کہ مغربی علاقے کی طرف واپس جا کر ملتان کے قرب و جوار میں اقامت اختیار کریں، جہاں ان کے والد نے کوتھوال کے مقام پر اپنے اہل خاندان کو آباد کیا تھا۔ یہ سنسان اور بنجر علاقہ تھا، جہاں زندگی گزارنے کی بہت کم سہولتیں میسر تھیں۔ یہی جگہ تھی، جہاں اقامت اختیار کرنے کا ان کے مرشد خواجہ قطب الدین نے انھیں حکم دیا ——— "جاؤ کسی ویرانے میں بستی بساؤ۔"

شیخ فرید نے اسی حکم کی تعمیل میں اجودھن کو اپنا مستقر بنایا جو دریائے ستلج کے مغرب میں، اسی دریا کی ایک معاون ندی کے کنارے واقع ہے۔ اب یہ مقام پنجاب (پاکستان) کے ضلع منٹگمری (ساہیوال) کا ایک چھوٹا سا، مگر خاصہ ترقی یافتہ قصبہ ہے۔ یہ جگہ اوچ، ملتان اور ڈیرہ جات جانے والی سڑکوں کا سنگم اور تجارتی مرکز بن جانے کے امکانات کی حامل تھی۔ ندی کو پار کرنے کے لیے کشتی بھی وہاں مل جاتی تھی۔ پنجابی میں اور بعض دوسری ہندوستانی بولیوں میں بھی کشتی کو "پٹن" کہتے ہیں۔ شیخ فرید نے اس کشتی کو اپنے قدموں سے متبرک بنا دیا تھا۔ اسی مناسبت سے آگے چل کر اس مقام کو پاک پٹن کہا جانے لگا اور آج

بھی اس کا یہی نام ہے. گرونانک کے سوانح میں لکھا ہے کہ شیخ فرید کے ایک خلیفہ شیخ ابراہیم (برہم) سے ان کی ملاقات پٹن (یعنی پاک پٹن)[1] میں ہوئی تھی۔

اجودھن، یا پاک پٹن، جس جگہ واقع ہے اسے بار (جنگلی علاقہ) کہتے ہیں - وہاں کے رہنے والوں کو آج بھی جانگلی کہا جاتا ہے۔ جانوروں کو چُرانے میں وہ بڑے مشاق ہوتے ہیں اور تعلیم کا تناسب ان میں بہت کم ہے۔ مذہباً وہ سب مسلمان ہیں۔ صدیوں قبل جب پنجاب کے بعض علاقوں میں غزنویوں کی حکم رانی تھی تو اس دور میں انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ برطانوی حکم رانوں نے، پہلی جنگ عظیم سے قبل اور اس کے بعد بھی اس علاقے میں بہت سے سابق فوجیوں کو آباد کیا، جن میں سے بیش تر سکھ تھے ۔انھیں آسان شرائط پر معافی کی زمینیں دیں۔ نہریں بنائیں، جس کی وجہ سے یہ علاقہ سرسبز ہوگیا۔ سکھ ہجرت کرکے اب ہندوستان آگئے ہیں۔ سیرالاولیا میں درج ہے کہ شیخ فرید نے چوبیس سال کی عمر کے بعد اپنی باقی زندگی اجودھن ہی میں بسر کی اسی ماخذ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی دور میں وہ لاہور میں سکونت پذیر ہونا چاہتے تھے، جس کے کنارے ایک دریا ہے، لیکن اپنے مرشد قطب الدین کے حکم کی تعمیل میں انھوں نے اجودھن کے ویرانے میں اقامت اختیار کی۔

اجودھن پہنچنے کے بعد شیخ فرید نے اپنے لیے ایک کچّا مکان بنایا

---

[1] اس کتابچے کے ساتھ ایک نقشہ بھی منسلک ہے، جس میں پاک پٹن کا محل وقوع درج ہے۔

اور اپنے اس نئے گھر میں رہنے کے لیے اپنی ماں کو لانے کی غرض سے اپنے چھوٹے بھائی شیخ نجم الدین متوکل کو بھیجا۔ اس سفر کے دوران میں جب ماں بیٹے ایک بے آب وگیاہ جنگل کو طے کر رہے تھے تو ماں کو شدید پیاس محسوس ہوئی۔ کہیں قریب پانی نہ ملا تو ماں کو وہیں چھوڑ کر وہ پانی کی تلاش میں نکلے۔ جب لوٹے تو ماں وہاں نہیں تھیں، جنھیں ایک جھاڑی کے سائے میں انھوں نے چھوڑا تھا۔ شیخ نجم الدین کو یقین ہو گیا کہ ان کی ماں کو کوئی جنگلی جانور کھا گیا ہے۔ پھر بعد میں اسی جگہ کچھ انسانی ہڈیاں بھی ملیں۔ شیخ نجم الدین نے یقین کر لیا کہ ان کی ماں ہی کی ہڈیاں ہیں۔ ان ہڈیوں کو ایک بورے میں بھر کر وہ شیخ فرید کے پاس اجودھن لائے۔ ان ہی ہڈیوں پر شیخ فرید نے میت کے آخری رسوم ادا کیے اور فاتحہ خوانی بھی کی۔

اجودھن میں شیخ فرید نے شدید تنگی و ترشی کی اور فلاحی زندگی بسر کی۔ جنگلی پیڑ بالو اور بنجر زمین میں اُگنے والی جھاڑیاں ہی اس علاقے میں پیدا ہوتی تھیں اور وہاں کے بسنے والے بھی جنگلی ہی تھے جو قبائلی جھگڑوں میں اُلجھے رہتے تھے۔ ایک ایسے علاقے میں اور ایسے لوگوں کے درمیان اقامت اختیار کرنا ایک خدا پرست انسان کا ایسا خود اختیاری فعل تھا، جسے انسانی تاریخ میں پہلے بھی اُن ہی جیسے لوگ اختیار کر چکے تھے۔ مشہور عالم شیخ نظام الدین اولیا جو شیخ فرید کے مرید تھے اور جنھوں نے شیخ سے ملاقات کے لیے تین بار دلّی سے اجودھن تک کا دشوار گزار سفر کیا تھا، ان کا بیان ہے کہ شیخ کے گھر میں اکثر کھانے کا سامان نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ ان کے گھر کے لوگ اور ان کے مریدین اپنے تئیں خوش

قسمت سمجھتے اگر کھانے کو انھیں ڈیلا مل جاتا جو ایک ترش جنگلی گوندی ہے اور بے برگ جھاڑی میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک اور پھل اسی علاقے میں ملتا ہے جسے پیلو کہتے ہیں۔ گوندی ہی کی طرح کا یہ پھل گرمیوں کے موسم میں پکتا ہے اور اس کے بیج میٹھے ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں صرف جَند اور کیکر کے خاردار درخت ہی اُگتے ہیں جو خشک سالی کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ جند میں ایک طرح کی پھیمی پیدا ہوتی ہے، جو بے مزہ نہیں ہوتی اور بھیڑ بکریوں کے لیے اچھے چارے کا کام دیتی ہے۔ اس گرم علاقے میں اِن چیزوں کے علاوہ اور کوئی چیز شاید ہی اُگتی ہو، جسے دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک مل سکے۔

شیخ فرید اپنے مُریدوں کو زنبیل دے کر، دریوزہ گروں کی طرح، اکثر بھیک مانگنے کو بھیجا کرتے تھے، کیوں کہ ایک صوفی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ طریق کار ان کے ابتدائی دور کا رہا ہوگا۔ جب اِن کے زہد و اتقا کی شہرت پھیلی اور ان کی دعاؤں کی برکت کا شہرہ ہوا تو جوق در جوق لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور نذرانہ پیش کرنے لگے، جسے اسلامی اصطلاح میں "فتوح" کہا جاتا ہے۔ چشتی روایت کے مطابق انھوں نے خانقاہ بنائی جس سے ملحق ایک عبادت خانہ تھا اور جہاں ان کے جہاں گرد مریدین اور دوسرے مسافر قیام کرتے۔ یہاں انھیں رہنے کی جگہ ملتی، کھانا ملتا، اور تربیت دینے کے لیے انھیں ذکر کے حلقوں میں بٹھایا جاتا۔ اس جگہ ان کے پاس عالم، صوفی اور درویش آتے۔ حصول برکت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ وہ ایک کھاٹ پر یا ہندوستانی سادھوں سنتوں کی طرح زمین پر بیٹھ کر ارد گرد بیٹھے

والوں کو روحانی تعلیم دیتے۔ ان کے وعظ میں اگرچہ عربی و فارسی کی وہ اصطلاحیں خاصی تعداد میں ہوتی تھیں جو اسلامی شریعت و طریقت دونوں میں داخل ہوگئی تھیں، تاہم ان کے ان خطبوں کی زبان وہی ہوتی تھی جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔

شیخ فرید کی زبان بنیادی طور پر ملتانی پنجابی تھی، جو کہ ان کی مادری زبان تھی۔ اس میں عہد وسطیٰ کی اُس ہندی یا ہندوی کی بھی خاصی آمیزش ہوتی، جو دہلی کے قرب وجوار میں بولی جاتی تھی، جہاں انھوں نے اپنی مریدی اور پھر خلافت کے دور کا ابتدائی زمانہ بسر کیا تھا۔ اس زمانے کا بیش تر حصّہ انھوں نے ہانسی میں گزارا تھا جہاں ہندی سے ملتی جلتی بولی بولی جاتی تھی۔ شیخ فرید نے اپنی خلافت کی طویل مدّت میں جو کچھ کہا اُسے مسلمان راویوں نے ان کی زبان میں قطعاً قلم بند نہیں کیا، بلکہ ان کی گفتگو اور ان کے مواعظ ادبی فارسی میں قلم بند کیے گئے ہیں جسے ان کی اصلی زبان کی لفظی رپورٹ نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ عالموں کے ساتھ علمی گفتگو میں شیخ فرید قدرتی طور پر فارسی ہی بولتے ہوں گے، لیکن عوام کے ساتھ باتیں وہ اپنی ہی زبان میں کرتے رہے ہوں گے کیوں کہ ہندوستان کے مقدس لوگوں کا، خواہ وہ عالم ہی کیوں نہ ہوں، آج تک یہی طریقہ رہا ہے۔ شیخ فرید نے اپنی مادری زبان میں جو شاعری کی تھی، اس کا صرف تھوڑا سا حصّہ سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب ہی میں محفوظ رہ گیا ہے، جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

چوتھا باب

شیخ فرید کی خلافت کے ابتدائی دور کی کچھ جھلکیاں

غذا اور لباس کے معاملے میں شیخ فرید انتہائی نفس کشی اور شدید مجاہدے کی زندگی بسر کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مختصر سی بوسیدہ کملی ان کے پاس تھی جسے اوڑھ کر وہ سوتے۔ اس سے اُن کا پورا جسم بھی مشکل ہی سے ڈھک سکتا تھا۔ رمضان کے دنوں میں شربت کی چھوٹی سی پیالی سے وہ روزہ افطار کرتے۔ شربت کا ایک بڑا سا پیالہ ان کے سامنے رکھا جاتا جس میں سے تھوڑا سا اپنے لیے رکھ لیتے اور باقی حاضرین میں تقسیم کر دیتے جو بالعموم غریب اور افطار کے لیے کوئی میٹھی چیز خریدنے کے وسائل سے محروم ہوتے تھے۔ زمین پر بیٹھ کر، جس پر کوئی فرش نہیں ہوتا تھا، شیخ فرید کھانا کھاتے۔ ان کے سامنے کوئی دسترخوان بھی نہ ہوتا، جو صاحبِ ثروت مسلمان استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سلطان ناصرالدین محمود جب اوچ گئے جو ملتان سے قریب ہی ہے، تو شیخ فرید کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ ان کی ہمرکابی میں سارا

شاہی لاؤ لشکر بھی تھا، جو اجودھن کے چھوٹے سے مقام پر شیخ کی زیارت کے لیے جمع ہو گیا۔ چونکہ ان ہزاروں آدمیوں کو اپنا دیدار کرانا شیخ کے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے ان کا لبادہ ایک جگہ چھت سے ٹانگ دیا گیا۔ لوگ آتے اور لبادے کو بوسہ دے کر چلے جاتے۔ آدمیوں کی اتنی کثرت تھی کہ لبادہ تار تار ہو گیا۔ پھر زیارت کے آرزومندوں کے شدید اصرار پر شیخ فرید مسجد میں آ گئے اور مریدوں کو حکم دیا کہ ان کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو جائیں تاکہ مجمع ان سے فاصلے پر رہے اور لوگ دور سے ان کا دیدار کر لیں۔ مریدین نے ان کی ہدایت پر عمل کیا، لیکن ایک بوڑھا فراش اس حلقے کو توڑ کر یکایک آگے بڑھا اور شیخ کے قدموں پر گر کر اس نے کہا "اے شیخ الشیوخ فریدالدین (مجمع کو دیکھ کر) آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں، آپ کو تو اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے" فراش کی یہ بات شیخ فرید کے دل میں ایسی لگی کہ وہ زار و قطار رونے لگے۔ انھوں نے اس سے معافی مانگی اور اسے دعائیں دیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے وعظ میں ہر انسان کو نرم دل ہونے اور بنی نوع انسان کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے کی روش اختیار کرنے پر زور دیا۔[1]

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسی موقع پر سلطان نے اپنے وزیر بلبن کی معرفت، جو آگے چل کر خود بھی سلطان بنا، شیخ کی خدمت میں چند گاؤں کا معافی نامہ اور کچھ نقد رقم بھی پیش کی۔ نقد رقم تو شیخ نے غربا و

---

[1] آدی گرنتھ میں شیخ فرید کی جو بانی ہے، اس میں بھی اس موضوع پر خصوصیت سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

مساکین میں تقسیم کردی اور معافی نامہ مندرجہ ذیل شعر کے ساتھ واپس کردیا!

شاہ مارا دہ دہد منت نہد   رازق مارزق بے منت دہد

(بادشاہ مجھے گاؤں دے کر احسان کرتا ہے، لیکن میرا رازق بلا کسی احسان کے رزق دیتا ہے)۔

مزید براں انھوں نے سلطان کو یہ پیغام بھی بھیجا، جس میں عوام کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں شدید تشویش کا اظہار تھا۔

"ملک بوزیر خدا ترس ضبط کن"

(اپنی مملکت خدا سے ڈرنے والے وزیر کے سپرد کرو)۔

یہ بہترین مثال تھی، اُس قناعت کی اور دنیوی مال و متاع سے عدم رغبت کی، جو صوفیا کی اہم ترین خصوصیت رہی ہے۔

شیخ فرید میں عفو اور درگزر کا مادّہ حد درجہ تھا۔ ایک ساحر نے اپنے جادو کے زور سے شیخ کو ایذا پہنچانے کی کوشش کی۔ طویل مدت تک بیمار رہنے اور دواؤں کے بے اثر ثابت ہونے کے بعد پتا چلا کہ اس ساحر نے شیخ کا پُتلا بنا کر اور اُس میں سوئیاں گاڑ کر اسے زمین میں دفن کر دیا ہے۔ جب وہ پُتلا کھود کر نکالا گیا اور سوئیاں بھی الگ کی گئیں تو شیخ صحتیاب ہو گئے۔ اجودھن کے مقامی حکمراں نے اس ساحر کو قتل کرنے کی پیش کش کی، لیکن شیخ نے اسے معاف کر کے اس کی جاں بخشی کرائی۔

ایک دن ایک عورت گھبرائی ہوئی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ کوئی یوگی اپنی ساحرانہ قوت کے بل پر روزانہ اس سے دودھ وصول کرتا ہے، جس سے اس کا نقصان ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ نے عورت

پر رحم کھا کر یوگی کے جادو کے اثر کو زایل کر دیا اور روزانہ جو دودھ اسے دینا پڑتا تھا اس سے وہ بچ گئی۔

ایسا لگتا ہے کہ درویشانہ ریاضتوں نے اور روحانیت نے غیر معمولی صلاحیتیں شیخ فرید میں پیدا کی تھیں، لیکن ان سے کام لینے کے وہ زیادہ شایق نہیں تھے۔ جب لوگوں نے تعویذ مانگنے کے لیے ان کے پاس آنا شروع کیا تو انھوں نے اپنے مرشد خواجہ قطب الدین سے دریافت کیا کہ جو لوگ تعویذ مانگتے ہیں انھیں وہ تعویذ دیں یا نہ دیں۔ اس کے جواب میں خواجہ نے فرمایا "لوگوں کی خواہشوں کو پورا کرنا نہ تمھارے اختیار میں ہے اور نہ میرے۔ لیکن تعویذ اللہ کے نام سے لکھا جاتا ہے اور اس میں اللہ ہی کا کلام ہوتا ہے، اس لیے جو بھی تم سے مانگے اسے تعویذ لکھ کر دے دو۔" مقدس بزرگوں کا یہی روشن انداز فکر ان میں اور اُن گنڈے تعویذ کرنے والوں میں خطِ امتیاز قائم کرتا ہے جو مافوق العادت قوتوں کے حامل ہونے کے مدعی ہوتے ہیں۔ خواجہ قطب الدین نے شیخ فرید کو ایک سنسان مقام پر اقامت اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا جو خدا کی برکتوں کے بے پایاں اسرار کی طرف اور صبر و ضبط کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اے بسا درد کاں ترا داروست　　اے بسا شیر کاں ترا آہوست

(درد ہی تمھارے لیے دوا ثابت ہوگا اور شیر تمھارے لیے ہرن بن جائیں گے)۔

شیخ فرید کی کراموں کے بہت سے قصے بیان کیے جاتے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ان سے کتنی عقیدت اور اُن کے دلوں میں

ان کی کتنی عظمت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص ان کی زیارت کے لیے روانہ ہوا، دوران سفر میں ایک رنڈی بھی اس کی ہم سفر ہوگئی، اور اپنے جال میں اسے پھانسنا چاہا۔ اس شخص کی نیت بھی خراب ہونے لگی۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کے منھ پر زور سے تھپڑ مارا اور اس کے ساتھ ہی غیب سے آواز آئی کہ یہ طرزِ عمل اس شخص کی بزرگی کے شایانِ شان نہیں ہے جس کی خدمت میں تم حاضر ہونے جارہے ہو۔ اس تنبیہ نے اس معصیت سے اُسے بچالیا جس سے اپنا دامن وہ آلودہ کرنے والا تھا۔ شیخ فرید کی خدمت میں جب وہ شخص پہنچا تو انھوں نے کہا "وہ ایک اچھی تنبیہ ہے جو اُسے راہ میں ملی تھی" اسی نوع کے واقعات نے لوگوں کو شیخ فرید کی کراماتی قوتوں کا یقین دلادیا تھا۔

ایک اور شخص کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے جسے ایک مقامی امیر نے سو ٹنکے کا نذرانہ دے کر شیخ کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ اس شخص نے خود اپنے لیے اس میں سے پچاس ٹنکے نکال لیے۔ شیخ کی خدمت میں پہنچ کر جب اس نے نذرانے کی نصف رقم پیش کی تو شیخ نے مسکرا کر کہا "یہ پچاس پچاس ٹنکے کی برادرانہ تقسیم ہے جو تم نے کی ہے۔" یہ سن کر وہ شخص اپنی خیانت پر شرمندہ ہوا اور اپنی غلطی کی معافی مانگ کر باقی رقم بھی شیخ کی خدمت میں پیش کردی۔ اس کی پشیمانی کو دیکھ کر شیخ نے اُس پر نوازش کی اور اپنے مریدین کے حلقے میں داخل کرلیا۔ آگے چل کر شیخ نے اسی شخص کو مبلغ بنا کر سیستان بھیجا۔

شیر خاں جو ملتان اور اوچ کا حکم راں تھا کسی وجہ سے شیخ سے عناد رکھتا تھا لیکن اس کے خلاف انھوں نے نہ تو کبھی کوئی ترش بات کہی اور نہ کوئی

منتقمانہ جذبہ ان کے اندر پیدا ہوا بلکہ اس شعر کے مطابق انھوں نے درویشانہ عمل پر قناعت کی:

افسوس کہ از حالِ منت نیست خبر آنگہ خبر شود کہ افسوس خوری

(افسوس! میرے حال کی تمھیں خبر نہیں ہے۔ جب میرا حال معلوم ہوگا تو تمھیں پشیمانی ہوگی)

شیخ خدا کی یاد میں اس درجہ مستغرق رہتے تھے کہ اپنے گھر والوں کا بھی شاذ ہی انھیں خیال آتا۔ دنیاوی رشتوں سے عدم تعلق بڑے مقدس صوفیوں کی خصوصیت رہی ہے۔ شیخ فرید کو اپنے بیٹے نظام الدین سے بہت محبت تھی، جو ایک جنگ میں منگولوں سے لڑتے ہوئے 1287ء میں کام آیا تھا۔ نظام الدین نے ایک شخص کی معرفت اپنے باپ کو سلام کہلایا، جو اسی طرف آرہا تھا۔ جب اس شخص نے سلام پہنچایا تو شیخ محویت سے بیدار ہوئے مگر سلام بھیجنے والے کو پہچاننے میں پھر بھی کچھ دیر لگی۔

ایک اور موقع پر شیخ فرید کی بیوی روتی پیٹتی حاضر ہوئی اور بتایا کہ بچہ بھوک سے مرگیا ہے۔ شیخ نے اپنے ذہنی سکون کو برقرار رکھتے ہوئے صرف یہ کہا کہ "خدا کا بندہ مسعود خدا کے حکم کو کیوں کر ٹال سکتا ہے۔ بچہ مرچکا ہے تو اسے دفنا دو۔"

ان کا انتہائی تیاگ اکثر یہ شکل اختیار کرتا تھا کہ نیا کپڑا پہننے سے وہ انکار کردیتے تھے۔ ایک خادم بنیے کے یہاں سے ایک پیسے کا نمک قرض لے آیا۔ جس کھانے میں یہ نمک ڈالا گیا تھا شیخ نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کردیا کیوں کہ ان کے اصول کے مطابق قرض کے پیسے سے لذت حاصل کرنا گناہ کے برابر تھا۔

پانچواں باب

کردار اور تعلیمات

شیخ فرید اپنے زمانے میں اسلامی علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ دینیات کی مختلف شاخوں کی تعلیم انھوں نے ملتان میں حاصل کی تھی۔ جو علم کا بہت بڑا مرکز تھا اور جہاں کی اسلامی مذہبی زندگی پر ان کے رشتے کے ایک بھائی بہاء الدین سہروردی چھائے ہوئے تھے۔ آگے چل کر انھوں نے دہلی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی جو اس وقت علم کے میدان میں سمرقند و بخارا کی ہمسری کرتا تھا۔ شیخ بہاء الدین کو روحانی میدان میں جو عظمت حاصل تھی اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہاول پور شہر کو ان ہی کے نام سے نسبت حاصل ہے۔ اس علاقے کی روحانی حکمرانی میں شیخ فریدالدین کے ساتھ شیخ بہاء الدین بھی حصہ دار تھے، اگرچہ شیخ فرید کے حلقۂ اثر کا دائرہ ان کے مرید نظام الدین اولیا کی وجہ سے زیادہ وسیع ہو گیا تھا، جن کی درگاہ دہلی میں ہے اور جن کے عرس کے موقع آج بھی ہزارہا ہزار زائرین ہر سال جمع ہوتے ہیں اور جو صدیوں سے بادشاہوں، وزیروں، شاعروں اور درویشوں کے لیے باعثِ کشش رہی ہے۔ شیخ فرید کی علمیت و فضیلت کی بنا پر انھیں شیخ الاسلام اور شیخ کبیر کہا جاتا ہے۔ پنجاب کے ایک

دور افتادہ اور ویران گوشے میں اقامت گزین ہونے کے باوجود کثیر تعداد میں معتقدین ان کی خدمت میں حصول برکت اور رشد و ہدایت کے لیے حاضر ہوتے۔ انھیں جو بے پایاں عظمت حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی وفات کے ایک صدی بعد جب تیمور وسیع اسلامی دُنیا پر چڑھ دوڑا اور ہندوستان میں داخل ہوا تو اجودھن کو اس نے بخش دیا۔ جہاں شیخ فرید کا مزار ہے۔ اس عظیم بزرگ کے مزار کے سامنے اس نے اپنے تیر و تفنگ تہ کر لیے اور سرِ عقیدت خم کرتا ہوا وہاں سے گزر گیا۔

مسلمان سوانح نگاروں نے شیخ فرید اور اس دور کے دوسرے صوفیا کی تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے' جو یقیناً صحیح بھی ہے لیکن ان بزرگوں نے تبلیغ کے سلسلے میں جو طریق کار اختیار کیا وہ یہ تھا کہ اپنی شیریں کلامی اور اپنی خوش اعمالی سے لوگوں کے دلوں کو وہ موہ لیتے تھے۔ شیخ فرید' اور دوسرے درویش بھی' ہندو یوگیوں سے اکثر مباحثے کیا کرتے تھے۔ ان بے تکلف مکالموں کے موقعوں پر روحانی ہم مشربی کی فضا پیدا ہوتی اور وہ سب ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل کر لیتے۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ یوگیوں سانس روکنے کی ریاضت ـــ جسے 'پراکسں' یا 'پران یام' کہتے ہیں' اکثر صوفی بھی کیا کرتے تھے اور اسے ان کی اصطلاح میں 'پاسِ انفاس' کہا جاتا ہے۔ ان باہمی ملاقاتوں میں روحانی مسائل سے متعلق ایک مشترک زاویۂ نگاہ پیدا ہوتا اور یہ ہندو سنت اور مسلمان صوفی عوام کی اخلاقی و روحانی تعلیم کے لیے ایک ایسا مرکب تیار کرتے جو مذہبی منافرت کے جذبے سے پاک ہوتا۔ اس پس منظر میں صوفیوں اور درویشوں کے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کام کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ تمام تر

نتیجہ تھا محبت آمیز طرزِ عمل کا اور سچی عقیدت مندی کا۔ یہ اُن علماء کی متشددانہ تحریک سے بالکل مختلف تھا، جو صوفیا پر، دل کو نہ لگنے والا یہ الزام رکھتے تھے کہ ان کا طریق کار قطعی راسخ الاعتقادی سے انحراف ہے۔

اُس دور کی مذہبی منافرت وعداوت کی فضا اور شورش انگیز ماحول کے مداوے کے لیے یہ صوفی محبت و آشتی کا جو مرہم لے کر آئے تھے اُس کی ایک نمایاں مثال شیخ فرید کا یہ واقعہ ہے کہ کسی شخص نے ان کی خدمت میں ایک قینچی پیش کی تو انھوں نے کہا "اس کی جگہ پر مجھے سوئی اور دھاگا دو، کیوں کہ میں کاٹنے کے لیے نہیں بلکہ دلوں کو جوڑنے کے لیے آیا ہوں"۔ ان کا یہ جواب تیرھویں صدی کے عظیم صوفی شاعر جلال الدین رومی کی مثنوی کے اس مشہور شعر سے مطابقت رکھتا ہے:

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

(تم اس دنیا میں لوگوں کو ملانے کے لیے آئے ہو، جدا کرنے کے لیے نہیں)۔

صوفیوں کی میٹھی میٹھی باتوں نے اور ان کی محبت آمیز روش نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ ترکِ دنیا ان کا مسلک تھا۔ وہ اگر صاحبِ ثروت اور ذی اقتدار لوگوں سے ربط پیدا کرتے تو ہم مسلکوں کی نگاہوں سے گر جاتے۔ سرکاری ملازمت کی، جسے شغل کہتے تھے، ان کے لیے ممانعت تھی۔ اسی پاک چلنی کی بدولت ان میں اتنی ہمت ہوتی تھی کہ بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے پیٹھ پھیر سکتے تھے، جیسا کہ شیخ نظام الدین اولیا نے ظالموں اور جابروں کا دلیری سے مقابلہ کیا تھا۔

شیخ فرید کے پاس ایک شخص آیا کہ بلبن جوان کا بے حد احترام کرتا ہے، اس کے نام وہ ایک سفارشی خط لکھ دیں۔ صاحبانِ اقتدار سے

تعلقات پیدا کرنا اور اُن کے ساتھ خوشامدانہ انداز سے پیش آنا، شیخ فرید اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس موقع پر انھوں نے بلبن کو یہ خط لکھا، جو بے حد معنی خیز ہے: "میں نے اس شخص کا معاملہ اللہ کے سامنے پیش کیا تھا، اور اب تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اگر تم نے اس شخص کو کچھ دیا، تو یہ تمھارا ممنون ہوگا۔ اگرچہ حقیقی دینے والا خدا ہی ہے۔ اگر تم نے اس کو کچھ نہ دیا تو تمھارا ہاتھ روکنے والا بھی خدا ہی ہوگا۔ اس لیے تم کو اس حالت میں معذور سمجھا جائے گا۔"

شیخ فرید کی یہ تعلیمات ان کی بانی سے بھی ظاہر ہوتی ہیں، جو اگرچہ مختصر ہیں تاہم سکھوں کی مقدس کتاب میں محفوظ ہیں اور ان کے ان روحانی تجربات اور اخلاقی عقائد کی آئینہ دار ہیں جو زندگی کے تجربات سے انھیں حاصل ہوئے تھے، اور ان کے وجود کا داخلی جز بن گئے تھے۔ اس کتاب کے اگلے حصے میں اس موضوع پر کچھ حد تک تفصیلی بحث کی جائے گی۔ مسلم سوانح نگاروں نے مختلف سیاق عبارت کے تحت، شیخ فرید کی جو گفتگوئیں قلم بند کی ہیں وہ ملفوظات یا حواشی کی شکل میں یا اور دوسری صورتوں میں ہیں، لیکن ان سب میں ان کی تعلیمات کی بنیادی باتوں کی تلخیص ہی ملتی ہے۔ ان بیانات کی صحت کا ہمیشہ مصدقہ ہونا اگرچہ شک وشبہ سے بالاتر نہیں ہوتا، تاہم جو تعلیمات شیخ فرید سے منسوب کی گئی ہیں، وہ بالعموم ایسی ہیں، جو عموماً اعلا پائے کے ان صوفیوں ہی سے وابستہ ہوتی ہیں، جو صوفیانہ مشرب کی بلند روایات کے حامل ہوتے ہیں ان مآخذ کی وساطت سے شیخ فرید کی جو تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں وہ یہ ہیں:

زکوٰۃ کی تین قسمیں ہیں۔ ان میں سے پہلی زکوٰۃ شریعت ہے (جو اسلامی شریعت کے مطابق ہر انسان پر فرض ہے)۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دو سو درم

میں سے پانچ درم ان لوگوں کو دیے جائیں جو حاجت مند ہوں۔ دوسری زکوٰۃ طریقت ہے، جو صوفی مسلک سے متعلق ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے دو سو درم میں سے صرف پانچ درم اپنے لیے رکھے جائیں۔ تیسری قسم خداشناسی کی زکوٰۃ حقیقت یہ ہے کہ دو سو کے دو سو درم خدائے تعالیٰ اور رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی راہ میں صرف کر دیے جائیں۔ یہ تیسری زکوٰۃ اس لیے عاید کی گئی ہے کہ درویش بننے کے لیے ضروری ہے کہ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں دے دیا جائے اور اپنی ذات کا خیال یک سر محو کر دیا جائے۔ اس ضمن میں شیخ فرید نے شیخ شہاب الدین عمر سہروردی[1] کا ذکر کیا ہے جن کے پاس روزانہ کم و بیش دس ہزار درم آتے تھے اور وہ سب کے سب خیرات کر دیتے تھے اور رات کو ان کے پاس ایک حبّہ بھی باقی نہیں رہ جاتا تھا شیخ فرید کے داماد شیخ بدرالدین اسحاق نے سوال کیا کہ اسراف کس کو کہتے ہیں؟ شیخ نے جواب دیا "بدنیتی سے صرف کرنا، خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنا اسراف ہے۔ لیکن اگر کسی کے پاس دونوں عالم کی دولت ہو اور وہ اُسے خدا کی راہ میں صرف کر دے تو یہ اسراف نہ ہوگا۔"

اس طرح ایک بار جب اُن سے پوچھا گیا کہ سچے درویش کی کیا پہچان ہے، تو انھوں نے جواب دیا، درویشی پردہ پوشی ہے۔ لوگوں کے عیوب کو آشکارا کرنا نہیں، بلکہ اُن کو چھپانا ہے۔ ایک درویش کے لیے چار باتیں ضروری ہیں؛ اپنی آنکھ کو اندھا کرلے تاکہ دوسرے کی برائیاں اسے نظر نہ آئیں۔ اپنے کانوں کو بہرہ کرلے تاکہ بُری باتیں وہ نہ سُن سکے۔ اپنی زبان کو گونگا کرلے تاکہ اس

1۔ مشہور صوفی بزرگ جن سے سہروردی سلسلہ شروع ہوا۔

کی زبان سے کوئی بُرا کلمہ نہ نکل سکے اور چوتھی چیز یہ ہے کہ اپنے پیروں کو توڑ دے تاکہ خواہش نفس کی آسودگی کے لیے کہیں جا نہ سکے۔ یہ چار باتیں جس شخص میں پائی جائیں وہ درویش ہے، خواہ اس کا لباس دنیا داروں ہی جیسا کیوں نہ ہو۔ یہ باتیں اگر کسی میں نہ ہوں تو حاشا وکلا وہ دروغ گو، راہزن اور خود پرست ہے اور درویشی سے اس کا دور، دور کا تعلق نہیں"۔ بعدازاں شیخ نے کہا کہ" اس راہ کی (درویشی کی) اصل یہ ہے کہ خدا کا خیال ہمہ وقت دل کے ساتھ رہے۔ یہ صفت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ حرام کی کمائی سے انسان پرہیز کرے اور دنیا اور اہل دنیا کی محبت سے اجتناب کرے"۔

رزق کے باب میں گفتگو کرتے ہوئے ایک مرتبہ شیخ فرید نے فرمایا کہ رزق کی بھی چار قسمیں ہیں: (1) وہ جو کہ مقدر ہو چکا ہے اور اس میں ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ (2) وہ جس کے حصول میں طمع اور لالچ کو دخل ہوتا ہے۔ (3) وہ جو جائز ضروریات کی تکمیل کے بعد بچا کر رکھا جائے اور (4) وہ جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے اور جس کا ملنا لازمی ہے۔ خدا کے حقیقی متلاشی کو دنیا وی چیزوں کے لیے غم و یاس کا ہرگز شکار نہ ہونا چاہیے جو مقسوم ہو چکا ہے وہ خدا ضرور دے گا۔ خدا کا حقیقی متلاشی وہ ہے جو سب کچھ خدا کی راہ میں صرف کر دے حریص و ذخیرہ اندوز خدا کی رحمت سے محروم ہوں گے۔

توبہ یا دنیا سے کنارہ کشی کی چھ قسمیں ہیں: دل کی توبہ یہ ہے کہ سفلی جذبات سے دل کو پاک رکھا جائے۔ زبان کی توبہ یہ ہے کہ اس عضو کو بُرائی

(از سیر الاقطاب)

کرنے سے پاک رکھا جائے۔ آنکھ کی توبہ یہ ہے کہ نامحرم پر نظر نہ ڈالی جائے، عیب جوئی سے بچا جائے اور ظلم کو دیکھ کر چشم پوشی نہ کی جائے۔ کانوں کی توبہ یہ ہے کہ خدا کے علاوہ باقی تمام آوازوں کے لیے کانوں کو بند کر لیا جائے۔ ہاتھ کی توبہ یہ ہے کہ جو جائز نہیں ہے اس کے حصول سے ہاتھوں کو روکا جائے اور آخری قدموں کی توبہ یہ ہے کہ بُری ترغیبوں کی راہ پر گامزن ہونے سے پیروں کو باز رکھا جائے۔

یہ تھا شیخ فرید کی تعلیمات کا طرز، جس میں عدم دنیاداری اور خدا پرستی کے عناصر سب سے زیادہ نمایاں درجہ رکھتے تھے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہ تمام اصول ان کی بانی میں بھی ملتے ہیں، جو گرنتھ صاحب میں محفوظ ہیں۔

درویش خواتین کے بارے میں اظہارِ خیال کی شیخ فرید سے درخواست کی گئی۔ اس نوع کے سوال کا ایک ایسے سماج میں پیدا ہونا قدرتی تھا، جس میں مردوں کو اقتدار حاصل ہو اور جہاں عورت کی اہلیت کو بادل ناخواستہ تسلیم کیا جاتا ہو۔ ایک صوفی خاتون رابعہ گزری تھیں، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کعبہ کو اوپر اٹھایا گیا تھا تاکہ وہ اسے دیکھ سکیں۔ شیخ فرید کے معاصرین میں بھی بی بی سائرہ اور بی بی فاطمہ سام تھیں۔ اس سلسلے میں خود شیخ کی ماں قرسوم بی بی کا بھی نام لیا جا سکتا ہے، جن کی درویشی فرید کی زندگی پر اثر انداز ہوئی تھی۔ ان خواتین کے بارے میں شیخ فرید نے فرمایا کہ یہ سب دراصل مرد ہیں جنھیں خدا نے عورتوں کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ ان کے عظیم المرتبت مرید شیخ نظام الدین اولیا نے اسی موضوع پر کہا تھا کہ "شیر جب جھاڑی سے نکل کر چھلانگ لگاتا ہے تو کوئی بھی یہ سوال

نہیں کرتا کہ وہ نر ہے کہ مادہ"۔ ایک خاتون بی بی فاطمہ نے شیخ فرید اور ان کے بھائی شیخ نجم الدین کے ساتھ بہن کا رشتہ استوار کیا تھا۔

شیخ فرید کی زندگی ہی میں ان کا حلقہ، اثر دور و نزدیک پھیل گیا تھا۔ چشتیہ سلسلے کو، ہندوستان میں جس کے بانیوں میں شیخ فرید بھی تھے، اپنے مبلغین کے حلم اور اُن کی خداترسی کی وجہ سے عوام النّاس میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ لوگ موسیقی اور شاعری کو اپنی تعلیمات کے پرچار کا ذریعہ بناتے تھے۔ چشتیوں کے سب سے بڑے حریف سہروردی سلسلے کے لوگ تھے جو بڑی شدّت سے محتاط روایات کی پیروی کرتے تھے اور ان میں اس حلم اور انسان دوستی کی کمی تھی جو چشتیہ سلسلے کا طرۂ امتیاز تھا۔ شیخ بہاء الدین زکریا کی کم آمیزی اور ان کے امیرانہ اطوار شیخ فرید کے انسان دوستانہ طرزِ عمل کے بالکل برعکس تھے۔ چشتیوں کی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ان کا اثر و رسوخ ہندوستان کے سارے طول و عرض میں پھیل گیا۔ چشتیہ سلسلہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو صرف برصغیر ہی تک محدود ہے۔ اس کے مرکز بنگال، بہار، اتر پردیش اور شمالی ہند میں ہریانہ و پنجاب کے علاوہ دہلی میں پائے جاتے ہیں۔ دکن میں اس کا عظیم مرکز گلبرگہ ہے، جہاں مشہور بزرگ خواجہ گیسو دراز نے عروج حاصل کیا تھا۔ راجستھان میں تو چشتیہ سلسلے کی اصلی زیارت گاہ اجمیر کی درگاہ ہے جس نے ہندوستانی زیارت گاہوں میں اپنی ممتاز ترین حیثیت کو برقرار رکھا ہے۔ اتر پردیش میں بدایوں کے مقام پر، جو نظام الدین اولیا کی جنم بھومی ہے، ان کا فرضی مزار ہے (اصلی مزار دہلی میں ہے) وہاں بہت سے خاندان ہیں جو ان کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں۔ 1947ء تک تقسیم ہند کے نتیجے میں مشرقی

پنجاب سے مسلمانوں کی ہجرت سے قبل، تھانیسر، ہانسی، کیتھل، پانی پت، نارنول اور کلو کھیڑی بھی چشتیہ سلسلے کے بڑے مرکز تھے، کلو کھیڑی کے علاوہ باقی سب مقامات اب ہریانہ میں ہیں۔

مغربی پنجاب میں بھی چشتیہ سلسلے کے بڑے بڑے مرکز ہیں جو آج بھی لاکھوں انسانوں سے عقیدت مندی کا خراج وصول کر رہے ہیں۔ اس علاقے میں پاک پٹن کے علاوہ دوسرے اہم مرکز مہر شریف، تونسہ، احمد پور، چاچڑاں، مکھد، جلال پور، گولڑہ اور کوٹ مٹھن وغیرہ ہیں۔ پاک پٹن میں شیخ فرید کی اولاد کو آج بھی بزرگی کا شرف حاصل ہے۔ ان کے پاس جائدادیں ہیں اور انھیں نذرانے ملتے ہیں۔ ان جائدادوں کا ایک حصہ سکھوں کے دورِ حکومت میں انھیں معافی کے طور پر عطا کیا گیا تھا۔ سلسلے کے بانیوں کی قناعت و توکل اب ایک دور کی آواز بن کر رہ گیا ہے۔ متذکرہ بالا مقامات پر جو موروثی پیر ہیں ان کا تقدس اب صرف رسمی ہے اور اس روشنی کا صرف پرتو ہی باقی رہا ہے جو ان کے بزرگ پھیلایا کرتے تھے۔ ان میں سے بیشتر مقامات پر نیم تعلیم یافتہ لوگ مقررہ مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں اور ان کو ساری دلچسپی درگاہ کے چڑھاوے سے ہوتی ہے۔ دیرینہ عظیم روایات کی یہ زوال پذیری صرف اسلام ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمارے ملک میں، اور دوسرے تمام ملکوں میں بھی، یہی حال ہے۔ بڑی بڑی زیارت گاہوں کے سجادہ نشین مفت کی رقمیں وصول کرنے کے عادی ہو گئے ہیں یہ لوگ انگریزوں کے دور میں، اور اس سے پہلے بھی، پریشان حال عوام کے زخموں پر مرہم رکھنے کی جگہ پر سرکاری ڈھانچے کا جزو بن کر اس لوٹ کھسوٹ میں حصہ دار بن گئے تھے، جس پر اس دور میں حکومت کا انحصار ہوتا تھا۔

اس گراوٹ کے دور میں بھی شیخ فرید، شیخ نظام الدین اور خواجہ معین الدین جیسے صوفیوں کے نام سیدھی راہ دکھانے والے ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور برتر زندگی کے متلاشیوں کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ شیخ نظام الدین کے ساتھ بڑے بڑے شعرا —— امیر خسرو، غالب اور اقبال نے اپنی عقیدت مندانہ وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ علاء الدین خلجی اور شاہزادی جہاں آرا نے ان کے مقبرے سے متصل دفن ہونے کی خواہش کی۔ شیخ فرید کے معتقدین آج پنجاب، اتر پردیش، کشمیر اور افغانستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے عقیدت مندوں کے گروہ میں سکھ بھی شامل ہیں جو ان کی اس بانی کے لیے ان کا احترام کرتے ہیں جو گرو گرنتھ صاحب میں موجود ہے۔ اس نوع کی مذہبی عقیدت مندی صرف شیخ فرید ہی کی عظمت کی نشان دہی نہیں کرتی ہے، بلکہ یہ عقیدت مندی خود سکھ قوم کے لیے بھی باعثِ فخر ہے، جو گرو نانک ہی کے الفاظ کی طرح شیخ فرید کے الفاظ کا بھی احترام کرتی ہے۔

شیخ فرید اور شہر فرید کوٹ

فرید کوٹ کا جدید شہر جو بھٹنڈے کے قریب ہے۔ شیخ فرید کے زمانے میں اس شاہراہ پر واقع رہا ہوگا جو دہلی اور ہانسی سے ملتان کو جاتی تھی اور روایتی طور پر ان ہی کے نام سے وابستہ ہے۔ اس جگہ سے اجودھن کا فاصلہ تقریباً سو میل ہوگا۔ فرید کوٹ (فرید کا قلعہ) کے نام کی شیخ فرید کے ساتھ وابستگی ایک معتبر روایت پر مبنی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس علاقے کا امیر، جس کا نام مُوکل تھا، اس جگہ ایک قلعہ تعمیر کر رہا تھا،

اور اس کی تعمیر میں شیخ فرید کو بیگاری کرنی پڑی تھی۔

آج اس قلعے کا کوئی نشان موجود نہیں ہے، لیکن آٹھ صدی قبل اس کے وجود میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ مروجہ روایت کے مطابق اس قلعے کی فصیل کے لیے شیخ فرید اور ان کے کچھ مریدوں کو پتھر اور گارا ڈھونا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں یہ کرامت بیان کی جاتی ہے کہ اس بزرگ کے سر پر جو گارے کا تسلا رکھا گیا وہ ان کے سر سے کوئی آدھ گز اوپر معلق ہو گیا۔ اس کرامت کو دیکھ کر ایک بھیڑ اکٹھا ہو گئی اور امیر نے درویش کے پیروں پر گر کر معافی مانگی۔ بابا فرید نے اس شہر کو برکت عطا کی اور یہ ان ہی کے نام سے منسوب ہوا۔ آج فرید کوٹ ایک ترقی پذیر شہر ہے اور ان کی دو یادگاریں وہاں محفوظ ہیں، جو ان کے نام سے وابستہ کہی جاتی ہیں۔ ایک تو ان کا چلّہ ہے، جہاں انھوں نے چلّہ کشی کی تھی۔ یہ جگہ بیچ شہر میں ہے۔ دوسری جگہ لیر مل ہے، جو شہر سے باہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ سے گزرتے ہوئے شیخ فرید نے کسی درخت کے سائے میں آرام کیا تھا۔ اس جگہ ان کے پھٹے ہوئے کپڑے خاردار جھاڑیوں پر ٹانگے گئے تھے۔

اس مقام کی جغرافیائی ماہیت اجودھن (پاک پٹن) ہی جیسی ہے۔ فرید کوٹ میں آج نہری پانی کی فراوانی ہے۔ یہی حال پاک پٹن کے علاقے کا بھی ہے۔ لیکن شیخ فرید کے عہد میں دونوں مقام بیابان تھے جہاں صرف جنگلی نباتات اور خشک سالی کا مقابلہ کرنے والی سخت جان جھاڑیاں ہی اُگتی تھیں۔ اس کے عام مناظر آج بھی غیر متنوع اور بے رونق ہیں، جہاں گرمیوں کے موسم میں لو چلتی ہے اور گرد کے طوفان اُٹھا کرتے ہیں۔ پانی

کمیاب تھا، جو انسانوں اور جانوروں کی اذیت ناک محنت کے بعد سطح زمین تک لایا جاتا تھا۔ اس صورتِ حال میں آج بھی کچھ ہی حد تک تبدیلی ہو سکی ہے۔ وہاں کے لوگ محنتی ہیں، مگر تمدن کی پُر فریبیوں سے مانوس ہوتے جا رہے ہیں۔ اس مقام کی کچھ فضا شیخ فرید کی ان مناجاتوں میں پائی جاتی ہے جو مقدس گرنتھ میں محفوظ ہیں اور جو عظیم روحانی ذخائر ہونے کے علاوہ تاریخی مطالعے کے لیے معلومات کی بھی کھان ہے، بہ شرطے کہ اس سے صحیح طور پر استفادہ کیا جائے۔

چھٹا باب

مُریدین اور دائرۂ اثر

ایک روایت کے مطابق شیخ فرید کے بیس خلیفہ تھے، جن میں سے تین خاص خلیفہ سمجھے جاتے تھے۔ شیخ فرید کے مریدین کی فہرست میں شیخ نظام الدین اولیا دہلوی کا نام سرفہرست ہے، اور شیخ الاعظم کی وفات کے بعد ان کی روحانی قلم رؤیا ان کے مشن کے وہی جانشین ہوئے۔ شیخ نظام الدین بدایوں میں پیدا ہوئے، جو بریلی سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر ہے اور جو سلطنت دہلی کے اوائل ہی سے اسلامی زہد و تقویٰ اور اسلامی علوم کا مرکز رہا ہے۔ التمش، سلطان بننے سے قبل، صوبہ دہلی کا ناظم یا گورنر تھا اور بعض عمارتوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اسی کے دور نظامت کی یادگار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء نے ابتدائی دور میں لاہور میں قیام کیا تھا۔ شیخ علی بن عثمان ہجویری (داتا گنج بخش) کے دور سے پہلے ہی، جنھوں نے گیارھویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا تھا، لاہور صوفیانہ راہ و رسم سے آشنا ہو چکا تھا۔ پھر شیخ نظام الدین اولیا بدایوں واپس آگئے۔ اسلامی علوم اور تصوف کی تعلیم انھوں نے شیخ فرید سے حاصل کی۔ کسی نہ کسی وقت شیخ نظام الدین اولیا دہلی ضرور گئے ہوں گے جہاں شیخ فرید سے

وہ متاثر ہوئے ہوں گے۔ انھیں اپنے مرشد کے ساتھ جو والہانہ محبت و عقیدت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تین بار اجودھن تک کا دشوار گزار سفر کیا اور اپنے مرشد کے ساتھ خود اختیاری عسرت کی زندگی گزاری۔

شیخ فرید کی زندگی کے حالات اور ان کی تعلیمات ان کے ایک مرید حسن علی کی کتاب فوائد الفوائد میں تفصیل سے درج ہیں[1] جو 719ھ و 722ھ کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ شیخ نظام الدین نے چونکہ 725ھ میں وفات پائی تھی، اس لیے اسے شیخ نظام الدین کے سوانح اور روزنامچے کا ایک ایسا مجموعہ کہا جا سکتا ہے کہ جس میں حسن علی نے اپنے مرشد کی وہ گفتگو تاریخ وار درج کی ہے جو مختلف ملاقاتوں میں انھوں نے کی تھی۔ اس کتاب سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار غیر معمولی طویل مدت کے بعد جب شیخ نظام الدین اپنے مرشد خواجہ فرید کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مندرجہ ذیل فارسی شعر پڑھ کر خواجہ نے اُن سے اپنی محبت و شفقت کا اظہار کیا:

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

(تمھارے فراق کی آگ نے دلوں کو جلا کر کباب کر دیا۔ تمھارے اشتیاق کے سیلاب نے زندگیاں تباہ کر دیں)

شیخ نظام الدین نے حدیث اور قرآن کے بعض اجزا کے علاوہ شیخ

---

[1] اس جملے میں شیخ نظام الدین کی جگہ "شیخ فرید" سہواً لکھا گیا ہے۔ فوائد الفوائد کے مصنف کا نام امیر حسن علا سنجری دہلوی ہے۔ (مترجم)

شہاب الدین سہروردی کی تصنیف عوارف المعارف بھی شیخ فرید سے پڑھی تھی جس کا موضوع فلسفۂ تصوف ہے۔

شیخ نظام الدین انتہائی دردمند انسان تھے اور لوگوں کے دُکھ درد کا انھیں ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ تھوڑے سے پانی یا روٹی کے ایک ٹکڑے سے وہ روزہ افطار کرتے اور آب دیدہ ہو کر کہتے "اتنے لوگ ہر طرف بھوکے پڑے ہوئے ہیں، میں اس کھانے کو کیوں کر زبان پر رکھوں۔" آج بھی دہلی میں ان کے مقبرے پر فقیروں کا مجمع رہتا ہے، جنھیں کھانا کھلایا جاتا ہے۔ وہ حد درجہ محتاط تھے۔ ایک دن دوپہر کے وقت قیلولہ کر رہے تھے کہ ایک درویش یا فقیر آیا، اسے لوٹا دیا گیا۔ عین اسی وقت شیخ نظام الدین نے خواب دیکھا کہ شیخ فرید انھیں ملامت کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "ایک غریب آدمی کو اگر تم کچھ نہ بھی دے سکو تو اس کے ساتھ کم از کم مہربانی سے تو پیش آؤ۔ کیا اس طرح شکستہ دل کر کے اُسے واپس کرنا مناسب تھا؟" بیدار ہوتے ہی انھوں نے اس درویش کو بلوایا اور اس بات کی اُنھیں شدید تکلیف ہوئی کہ ان کے طرزِ عمل سے ان کے مرشد کو ناگواری ہوئی۔

کسی شاعر نے مندرجہ ذیل اشعار میں شیخ فرید کے ساتھ شیخ نظام الدین کی عقیدت مندی بیان کی ہے:

زاں روز کہ بندۂ تو دانند مرا　　　بر مردمکِ دیدہ نشانند مرا

لطفِ عامت عنایتے فرمود است　　　ورنہ کیم و چہ ام چہ خوانند مرا

(جس دن سے لوگوں نے جانا ہے کہ میں تمھارا غلام ہوں، لوگوں نے آنکھوں کی پتلی میں مجھے بٹھایا ہے۔

آپکے لطفِ عام نے میرے حال پر عنایت فرمائی ہے، ورنہ میں
کون اور کیا ہوں اور میری کیا حقیقت ہے!)

شیخ فرید کی دردمندی اور عفو کا جذبہ مندرجہ ذیل فارسی اشعار
سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

ہر کہ مرا رنج دادہ، راحتش بسیار باد
ہر کہ مرا یار نبود، ایزد اُورا یار باد
ہر کہ خارے افگند در راہ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

(ہر وہ شخص جس نے مجھے رنج پہنچایا ہے، خدا اس کو بہت راحت
نصیب کرے۔ ہر وہ شخص جو میرا دوست نہ بن سکا، خدا اس کا دوست
بنے۔ ہر وہ شخص جس نے دشمنی سے میری راہ میں کانٹے بچھائے ہیں اس
کی زندگی کے باغ میں جو پھول بھی کِھلے وہ کانٹوں سے پاک ہو)

ایک ایسے دور میں جب کہ رواداری ایک عام قدر نہیں بنی تھی، شیخ
فرید دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ فراخ دلانہ رواداری سے
ساتھ پیش آتے۔ بعض اہل ہنود کی رسمی صنم پرستی کے بارے میں ان کا
انداز فکر شاعر امیر خسرو کے اس مصرع سے واضح ہوتا ہے، جس سے ان
کے شدید مفاہمانہ طرز عمل کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

(ہر قوم کا اپنا راستہ، اپنا دین اور اپنا مرکز پرستش ہوتا ہے)

لاتعداد انسانوں کو شیخ نظام الدین سے عقیدت رہی ہے۔ قریبی
زمانے میں ان کے عقیدت مندوں میں مرزا غالب بھی تھے جو ان کے مزار

کے قریب ہی مدفون ہیں۔ یہی بات امیر خسرو اور شاہجہاں کی بیٹی شاہزادی جہاں آرا کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ شیخ نظام الدین نے اپنے مسلک کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے بعد ایک اور عظیم صوفی شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو چھوڑا۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ نظام الدین خسروانہ الطاف سے بے نیازی برتتے تھے اور ظلم و تعدی کے مقابلے میں آزادانہ روش اختیار کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ علاء الدین خلجی نے کاروبار سلطنت سے اُنھیں وابستہ کرنے کی کوشش کی اور مذہبی امور میں ان سے صلاح و مشورہ کرنا چاہا تھا، لیکن دنیاوی معاملات سے بے تعلقی کے چشتی مسلک کے عین مطابق انھوں نے اس جال میں پھنسنے سے انکار کر دیا، اور کہلا بھیجا کہ "ہم درویشوں کو بادشاہوں اور اُن کے معاملات سے کیا تعلق؟ میں ایک درویش ہوں اور شہر سے اور شہر کے معاملات سے دور ہوں اور بادشاہ اور رعایا دونوں کی فلاح و بہبود کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں۔ بادشاہ نے اگر پھر اس طرح کا کوئی پیغام بھیجا تو میں اس جگہ کو چھوڑ دوں گا۔ خدا کی دنیا بہت وسیع ہے۔" جب بادشاہ نے ان کی خدمت میں خود حاضر ہونے کی خواہش کی، تو شیخ نے کہلایا "اس فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔" علاء الدین کے بیٹے قطب الدین مبارک نے جب شیخ نظام الدین کو پریشان کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے صرف یہ کہہ کر اسے نظر انداز کیا کہ "ہنوز دلّی دور است" (ابھی دہلی دور ہے) کہا جاتا ہے قطب الدین کے دہلی پہنچنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ شیخ کے مندرجہ بالا الفاظ ضرب المثل بن گئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے

کہ مقصد جب تک حاصل نہ ہوجائے، اس کا حصول اُس وقت تک یقینی نہیں ہوتا۔

شیخ فرید کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کی نشانیاں شیخ نظام الدین اولیا کو دہلی بھیجی گئیں، کیوں کہ وہ اس وقت دہلی ہی میں تھے۔ بڑے چشتی صوفیوں کے سلسلے میں یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ اپنے مرشد کے انتقال کے وقت اُن میں سے کوئی بھی ان کے پاس موجود نہیں تھا۔ شیخ فریدالدین کی شیخ نظام الدین سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب مؤخرالذکر دہلی کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ شیخ فرید کو جب معلوم ہوا کہ ان کے مرنے کا وقت قریب آگیا ہے تو انھوں نے شیخ نظام الدین کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے خلافت نامہ تیار کیا، جس کی رو سے وہ اُن کے بعد امام یا اس عہد کے لیے روحانی رہنما قرار پائے۔ خلافت کی نشانیاں انھیں قاصد کی معرفت روانہ کی گئیں۔

ہندوستان کی اسلامی روحانی دنیا کی تاریخ میں خواجہ معین الدین چشتی کے ساتھ ساتھ شیخ نظام الدین کا دوسرا اہم ترین نام ہے۔ سلطان المشائخ، اور محبوب الٰہی کے القاب سے ان کی عزت افزائی کی گئی ہے۔

شیخ فرید کے دوسرے معتبر خلیفہ شیخ جمال الدین ہانسوی تھے۔ مرشد کو اُن پر اس درجہ اعتماد تھا کہ انھوں نے یہ ہدایت کی تھی کہ ان کی طرف سے جاری کردہ کوئی بھی خلافت نامہ مستند نہ سمجھا جائے جس کی شیخ جمال الدین نے تصدیق نہ کی ہو۔ ایک بار کوئی شخص شیخ فرید کا خلافت نامہ ان کے پاس لے گیا جسے انھوں نے چاک کر دیا۔ جب اس شخص نے شیخ فرید سے شکایت کی تو انھوں نے جواب دیا "جمال نے جسے چاک کیا ہے، اسے فرید جوڑ نہیں سکتا"

یہ جمال الدین ہی سے شیخ فرید کے تعلق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی کے بارہ سال ہانسی میں بسر کیے۔ شیخ فرید انھیں صرف جمال (حُسن) کہا کرتے تھے۔ ان کی خود فراموشی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ شیخ فرید کے زیرِ اثر آنے کے بعد انھوں نے اپنی پوری زندگی درویشانہ ریاضتوں میں گزاری۔ ایک بار شیخ بہاء الدین سہروردی نے شیخ فرید سے خواہش کی کہ جمال الدین کو خلیفہ بنانے کے لیے وہ انھیں دے دیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ "اپنے جمال (حُسن) کو کوئی کسی دوسرے کو دے سکتا ہے؟" بہرکیف جمال الدین، ایک کم زور لمحے میں، شیخ بہاء الدین کے پاس چلے گئے۔ شیخ فرید کو یہ بات حددرجہ ناگوار ہوئی اور پھر پوری طور پر پشیمان ہونے کے بعد ہی انھیں دوبارہ شیخ فرید کا لطف و کرم حاصل ہوسکا۔ جمال الدین کا اپنے مرشد سے پہلے انتقال ہوا اور وہ ہانسی میں مدفون ہوئے، جہاں ان کا مزار آج بھی مسلم زیارت گاہ ہے۔ اسی جگہ کچھ اور صوفیوں کے بھی مزار ہیں جنھیں قطب سمجھا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے اس جگہ کو چہار قطب کہا جاتا ہے۔ جمال الدین کے بیٹے برہان الدین کو جب وہ بچے ہی تھے، ان کی دایہ نے حصول برکت کے لیے شیخ فرید کی خدمت میں پیش کیا تو شیخ فرید نے انھیں جمال الدین کی جگہ پر اپنا خلیفہ بنانا چاہا۔ دایہ نے کہا کہ ابھی تو "یہ بالا (بچّہ) ہی ہے"۔ اس کے جواب میں شیخ نے کہا "چودھویں کا چاند بھی، پہلی رات میں چھوٹا ہی ہوتا ہے۔ ان دونوں کی یہ گفتگو اپنی اصلی زبان ہندی میں محفوظ ہے۔[1] اس زمانے میں یہی زبان شمالی ہند میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ برہان الدین بھی آگے

---

[1] ہندی میں ان کے الفاظ یہ تھے: پونم کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔

چل کر اپنے باپ ہی کی طرح بڑے صوفی ہوئے۔

شیخ فرید کے ایک اور بڑے مرید شیخ علاء الدین صابر کلیری تھے۔ انھوں نے رڑکی کے قریب کلیر کو اپنا مرکز بنایا تھا، جہاں ہر سال ان کے عرس کے موقع پر ان کے معتقدین جمع ہوتے ہیں۔

چشتیہ سلسلے کا اثر و رسوخ سارے ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی درگاہیں بنگال، گجرات، دکن، اتر پردیش اور بہار کے علاوہ دہلی، راجستھان اور پنجاب (آزادی کے وقت تک) میں پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے کے جن بزرگوں نے بڑا نام پیدا کیا ان میں قابلِ ذکر شیخ عبد القدوس ہیں جو سہارن پور میں گنگوہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا تھا۔ شیخ سلیم چشتی ہیں، جو شیخ فرید ہی کی اولاد تھے اور جنھوں نے سیکری کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ ان ہی کی دعا سے اکبر کے یہاں ایک بیٹا سلیم پیدا ہوا تھا، جو آگے چل کر جہانگیر بنا۔ ان کے علاوہ اٹھارویں صدی کے دہلوی علما شاہ ولی اللہ اور شاہ کلیم اللہ کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے احیائی تحریکیں چلائیں۔ تھانیسر اور ہانسی کے مسلمانوں کے ترکِ وطن سے قبل یہ جگہیں بھی چشتیوں کے اہم مرکز تھیں، اب بھی مغربی پنجاب میں اس سلسلے کے ان گنت مرکز ہیں جنھوں لکھوکھا انسانوں کا احترام اور ان کی عقیدت مندی حاصل ہے۔ سہروردیہ سلسلہ جو ایک زمانے میں بڑا صاحبِ اقتدار تھا اور جس کے مرکز ملتان، اوچ اور ان ریاستوں میں تھے، جو بعد میں مل کر بھاول پور کی ریاست بنے اس چشتیہ سلسلے کی روز افزوں ترقی کے سامنے دب کر رہ گیا، جس کا مرکز پاک پٹن تھا اور جسے شیخ فرید نے تقدس بخشا تھا۔

ساتواں باب

آخری ایام اور وفات

شیخ فرید نے 1265ء (664ھ) میں محرم کی پانچویں تاریخ کو 92 سال کی عمر میں وفات پائی (قمری حساب سے ان کی عمر 95 سال تھی) انتقال کے دن بھی ان کا ذہن یادِ الٰہی میں مستغرق تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نماز ادا کی، لیکن انھیں یاد نہیں رہا کہ وہ نماز پڑھ چکے ہیں، چناں چہ دوبارہ نماز ادا کی۔ اپنی زندگی ہی میں انھوں نے شہرت حاصل کر لی تھی اور وہ ایک تحریک، ایک ادارہ بن گئے تھے۔ دور ونزدیک ان کا احترام کیا جاتا تھا، اور اتنی صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کی حیات ہی میں انھیں ایک سو ایک ناموں سے یاد کیا جانے لگا تھا اور ان میں سے ہر نام ان کے کردار کی کسی نہ کسی خصوصیت کی نشان دہی کرتا تھا۔ مختلف زبانوں میں، مختلف زبانوں کے، شاعروں نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک فارسی شاعر نے ان الفاظ میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

پیرِ من پیر است مولانا فرید ہم چو او در دہر مولانا فرید
(میرا پیر مولانا فرید ہے۔ اس کا مثل خدا نے پیدا نہیں کیا)

ایک ایسے عظیم مصلح کی حیثیت سے ان کا احترام کیا جاتا تھا جن کا قرب انسانوں میں شرافت کے جذبات پیدا کرتا تھا۔ ان کا خصوصی لقب گنج شکر ہے۔ اسی لقب سے عام طور پر وہ مشہور ہیں اور پنجاب کی ادبی روایات میں وہ رچ بس گئے ہیں، اور ہندو مسلمان سب ہی ان کی یاد کو سینے سے لگائے ہیں۔ وارث شاہ نے "ہیر" میں ان کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے خدام بھی روحانیت کا منصب رکھتے ہیں[1] ایک اور پنجابی شاعر میاں محمد بخش نے اس عظیم شاعر کو ان الفاظ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے

شاعر بہت پنجاب زمیں دے ہوئے دانش والے ...
اوّل شیخ فرید شکر گنج عارف اہلِ ولایت
ہک ہک سخن زباں اُوہ دِی دا رہبر راہِ ہدایت

(شاعروں میں سب سے بڑے شاعر شیخ فرید شکر گنج ہوئے ہیں، جو عارف اور اہلِ ولایت تھے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر حرف رہبر راہِ ہدایت ہے)[2]

یہ خراجِ عقیدت اس اعتبار سے اہم ہے کہ انیسویں صدی عیسوی

---

[1] جندھے سیوکاں دے گھر این پیریاں نے
[2] اس جگہ پہلے مصرع کے معنی حذف ہو گئے ہیں، جو یہ ہیں: پنجاب کی سرزمین نے بڑے بڑے دانش مند شاعر پیدا کیے ہیں۔ (مترجم)

کے اس شاعر کو اس کا احساس تھا کہ شیخ فرید نے شاعری بھی کی تھی۔ وہ مسلمان مصنفین جنھوں نے شیخ فرید کے بارے میں لکھا ہے عموماً ان کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں نہیں کیا ہے، جو گرو گرنتھ صاحب میں ملتا ہے اور جس کی وساطت سے ان کی عارفانہ شاعری کی یاد لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ یہ امر کہ شیخ فرید ایک معلّم اخلاق تھے اور انھوں نے اپنے لوگوں کی زبان میں شاعری کی تھی، ان کی عظمت کے تابناک پہلوؤں میں ایک اور روشن پہلو کا اضافہ ہے۔ اسی بنا پر، ایک طرف شیخ فرید کو اگر دور و نزدیک ایک مصلح کی حیثیت سے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، تو دوسری طرف اہلِ پنجاب کے دلوں میں بھی ان کے لیے ایک مخصوص جگہ ہے، کیوں کہ پنجابی زبان کے شاید وہ اوّلین شاعر ہیں، جن کا منضبط کلام ہم تک پہنچا ہے۔ یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو تمام پنجابی بولنے والوں کو، خواہ وہ کہیں رہتے ہوں اور ان کا کوئی بھی مسلک ہو، انھیں فرید کی محبت کے رشتے میں منسلک کر دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے ایسے درویش پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے انسانوں کے باہمی رشتوں میں رس گھولنے اور مذہبی تعلیمات کو منافرت اور آویزشوں سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے، تاہم مسلمان درویشوں میں شیخ فرید ہی ایک ایسی منفرد شخصیت ہیں، جن کا سکھ احترام کرتے ہیں، جن کا مسلک ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جن کے مصلح شیخ فرید سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ان کی ذات کو، ان کے نام کے عین مطابق فردِ فرید بنا دیتی ہے۔ گرو نانک جو شیخ فرید کی وفات کے تین صدیوں کے بعد آئے تھے، ان کے دوش بدوش آج بھی شیخ فرید کو پنجاب کے معروف ترین درویشوں

میں شمار کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے جہالت اور روحانی تاریکی میں گھرے ہوئے عوام کو روشنی دکھائی تھی اور ان کی زندگی میں شیرینی پیدا کی تھی۔

آٹھواں باب

شیخ فرید بحیثیت شاعر

جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے شیخ فرید کے مسلم عقیدت مندوں اور سوانح نگاروں کی کتابوں اور ملفوظات میں ان کے جو حالات ملتے ہیں[1] ان میں ان کی فارسی و عربی دانی پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے اور ان کے نام کے ساتھ 'شیخ الاسلام' اور 'شیخ کبیر' جیسے القاب استعمال کیے گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیخ فرید کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو ان کے مسلم سوانح نگاروں نے اپنی تصانیف میں حقیقی رنگ میں پیش کرکے محفوظ کر دیا ہے لیکن ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی ہے جو صوفی درویش کا پہلو ہے۔ اس کا مظہر "بابا" (مقدس باپ) کا عوامی لقب ہے' وہ 'بابا' جسے عوام الناس سے محبت تھی اور جو ان کے دکھ درد کا اپنی شفا بخشی سے مداوا کرنا چاہتا تھا۔ لوگ ان کے پاس مسیحائی کے لیے نیز آفات سے اور ارواحِ خبیثہ کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے آتے رہے ہوں گے۔ یہی طریقہ تھا صوفیوں کے مختلف سلسلوں کے درویشوں اور بزرگوں سے عقیدت مندی کے

---

[1] جواہر فریدی میں ان کا سرسری ذکر ملتا ہے۔

اظہار کا۔

شیخ فرید کی علمیت و فضیلت سے متعلق معلومات اگرچہ محفوظ نہیں رہ سکی ہیں، جس کی وجہ ان کے مرید شیخ نظام الدین اولیا کے واضح بیان کے مطابق یہ ہے کہ چشتی سلسلے کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس سلسلے کے بزرگوں نے کتابیں تصنیف نہیں کیں تاہم عوام الناس سے ان کی محبت اور پدرانہ شفقت 'بابا' کے اس لقب سے ظاہر ہوتی ہے، جس سے بعد کی نسلوں نے انھیں یاد کیا ہے اور آج بھی یاد کرتے ہیں۔ اسی لقب سے تمام مسلمان انھیں یاد کرتے ہیں، اور یہ ایک غیر معمولی مظہر ہے ان کی عظمت کا۔ شکر گنج کی حیثیت سے انھیں ایک بلند مقام حاصل ہے اور صوفی کی حیثیت سے ان کی صلاحیتیں غیر معمولی تھیں جو عنایت خداوندی سے عطا ہوئی تھیں۔

شیخ فرید شہر ملتان کے مضافات میں پیدا ہوئے تھے جہاں آغاز تاریخ کے زمانے ہی سے ملتانی پنجابی بولی جاتی تھی، اور آج بھی بولی جاتی ہے۔ فارسی و عربی کا علم یوں تو انھیں ورثے میں ملا تھا لیکن اس علمی فضا سے بھی انھوں نے اکتساب کیا تھا، جو ان لاتعداد علما کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی جو منگولوں کے مظالم سے پناہ لینے کے لیے (بارھویں صدی کی پہلی چوتھائی میں) ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے۔ شیخ فرید نے اپنی جنم بھومی اور ملتان کے علاوہ طویل عرصہ دہلی، ہانسی اور اجمیر میں بھی گزارا تھا جہاں ہندی یا ہندوی کی ایک شکل بولی جاتی تھی۔ عام لوگ جو صوفی درویشوں کی خدمت میں روحانی تعلیم کے لیے، یا حصول برکت کی نیت سے، یا اپنے مسائل لے کر حاضر ہوتے تھے، وہ مقامی بولیوں ہی میں اپنا مدعا عرض کرتے رہے ہوں گے۔ یہ درویش بھی کم و بیش ان ہی بولیوں میں جواب دیتے، جس میں مختلف

رنگ کے مذہبی خیالات ٹھیک طور پر ادا کرنے کے علاوہ عالمانہ اصطلاحات
کی مرصع کاری بھی ہوتی جس طرح روزانہ زندگی میں انتظامی اصطلاحوں کو
سنتے سنتے لوگ انھیں سمجھنے لگتے ہیں، اسی طرح وہ مذہبی اصطلاحیں بھی، جو
عربی و فارسی سے ماخوذ ہوتی تھیں، صوفیا کی وساطت سے لوگوں کی سمجھ میں
آنے لگی ہوں گی۔

فارسی زبان، اور عربی بھی اگرچہ عالمانہ مباحثوں میں، انتظامی کاروبار
میں اور مذہبی معاملات میں بولی جاتی تھی، تاہم یہ قرینِ قیاس نہیں ہے
کہ درویشوں نے عام لوگوں سے بات چیت کے لیے فارسی زبان استعمال کی
ہو۔ پنجاب میں صدیوں سے مسلمان مختلف اصنافِ سخن میں مذہبی شاعری
کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں۔ اس میں حمد بھی ہے اور نعت
بھی، قصص (پیغمبرِ اسلام اور بزرگانِ دین کے قصّے) بھی ہیں اور عبودیت
کے نغمے بھی، ان کے علاوہ پرہیزگاری کے مختلف موضوعات پر بھی طبع آزمائی
کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "ہیر" جیسے سیکولر قصّے میں بھی صوفیانہ رنگ
ملتا ہے۔ گویا ان قصّوں میں روحانیت کو ایک پردہ بنایا گیا ہے۔ اسلامی
دنیا کے معروف ترین قصص میں یوسف زلیخا کی داستان بھی شمار کی جاتی
ہے۔ پنجابی زبان میں بھی اس کے درجنوں ترجمے ملتے ہیں۔ شریعت اور
طریقت کے موضوع پر بھی پنجابی زبان میں بہت سے منظوم رسائل لکھے گئے
ہیں جنھیں سن کر مسلمانوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ اشک بار
ہو جاتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ باور کرنا دشوار نہیں ہے
کہ شیخ فرید جیسے عظیم صوفی اور مصلح نے اپنے روحانی تجربات کو اس ملتانی
پنجابی میں نظم کرنے کا وقت نکالا ہوگا، جو ان لوگوں کی زبان تھی جن کے درمیان

انھوں نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی اور اجودھن میں سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنی خلافت کی ساٹھ برس سے زیادہ مدت بسر کی تھی۔

شیخ فرید کی شاعری کا ایک چھوٹا سا حصہ گرونانک اور ان کے روحانی جانشینوں ــ سکھوں کے مقدس گروؤں ــ کے ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے مقدس گرنتھ صاحب میں اسے محفوظ کر دیا۔ شیخ فرید کے کلام کے اتفاقی طور پر محفوظ کیے جانے کے لیے پنجابیوں کی نسلوں کو نیز ان تمام لوگوں کو، خواہ وہ کہیں بھی ہوں، جو شیخ فرید کا احترام کرتے ہیں، سکھ گروؤں کا اور سکھ روایات کا ممنون ہونا چاہیے۔

نواں باب

مقدس گرنتھ میں شیخ فرید کی بانی

سکھوں کے مقدس صحیفے 'گرو گرنتھ صاحب' میں روحانی اور عارفانہ خیالات منظوم شکل میں ملتے ہیں' جو سکھوں کے پانچ گرو‌ؤں اور مختلف فرقوں اور مسلکوں سے تعلق رکھنے والے بھگتوں یا درویشوں کی تخلیق ہیں۔ ان کے علاوہ ان مغنیوں کا کلام بھی اس میں شامل ہے جو گرنتھ صاحب کو آخری وقطعی شکل دینے والے' گرو نانک کے سلسلے کے پانچویں گرو' گرو ارجن کی خدمت میں ہمہ وقت حاضر رہتے تھے۔ جن بھگتوں کو اس مقدس صحیفے میں نمایندگی دی گئی ہے ان میں کبیر' روی داس نام دیو اور شیخ فرید کے نام سب سے اہم ہیں۔ ان کے علاوہ جو اور بہت سے نام ملتے ہیں ان میں اکبر کے زمانے کے ایک مسلم صوفی شیخ بھیکن بھی ہیں' جو کاکوری کے رہنے والے تھے۔ گرنتھ صاحب میں شمولیت کے لیے بھگتوں کے کلام کا انتخاب گرو نے ہی' بعض مخصوص معیاروں کے تحت' کیا تھا' وہ معیار یہ تھے: انتخاب میں جن کے کلام کو شامل کیا جائے وہ موحّد ہوں اور خدا ـــ خالقِ کائنات ـــ کے سوا کسی اور کی ربوبیت پر ایمان نہ رکھتے ہوں یا ذات پات کی تفریق سے بالاتر اور لازمی طور پر انسان دوستی کے اصولوں پر کاربند ہوں۔

اس نوع کی جملہ قابلِ اعتراض رسموں کو برتنے سے گریز کرتے ہوں جو تسکتاؤں میں اور سفلی عمل کرنے والوں میں رائج تھیں، توہمات سے آزاد ہوں اور اپنی تعلیمات کو باطل عقائد کی آلایش سے پاک رکھتے ہوں۔ اس کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ اس انتخاب میں ان ہی کا کلام شامل کیا جائے جو گرو کے ہم مذہب ہوں اور وہ کسی اور مذہب مثلاً اسلام، سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ زور جس بات پر دیا جاتا تھا وہ یہ تھی کہ صاحبِ کلام نے مذہب کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا ہو جو رواداری، ہم آہنگی اور انسان دوستی کی برتر اخلاقی قدروں کے حامل ہوں۔ مزید برآں، جن بھگتوں کا کلام انتخاب میں شامل کیا جائے وہ روحانی بصیرت کے مالک ہوں، خواہ کسی بھی مسلک سے ان کا تعلق ہو، اور ان کا کلام عبد اور معبود کے مابین قریبی تعلق پیدا کر سکے، نیز سطحی روایت پرستی سے اور ظاہری مذہبی رسوم کی پابندی سے پاک ہو۔

مناجاتوں کے اس مجموعے کو مرتب کرتے وقت نظموں کے ایک وسیع ذخیرے کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ گروؤں نے اس امر کی کوشش کی تھی کہ ہندوستانی عوام کے واسطے ایک ایسا مجموعہ تیار کریں جو ان کے لیے عوامی انجیل کا کام دے سکے، ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرے، ان کے افکار و عقاید میں بلندی لائے، اُن اثرات کا وہ مقابلہ کر سکیں جو مسلکوں کے اختلاف کی وجہ سے منافرت پیدا کرتے ہیں۔ گرنتھ صاحب میں شیخ فرید کی بانی، یا کلام کی شمولیت کو اسی تناظر کو سامنے رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ ہر ہر لفظ جو گرنتھ صاحب میں شامل کیا گیا ہے، خواہ وہ کہیں سے بھی اخذ کیا گیا ہو، گرو کے فرمان کے مطابق، یک ساں تقدس کا حامل ہے اور مقدس احکام کی طرح اس کا احترام کرنا لازمی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کبیر، ردی داس، نام دیو، فرید

یا کسی اور درویش کی مناجات جب پڑھی یا غنا کی جاتی ہے تو اس وقت کوئی بھی سکھ اس سے بلند تر مقام پر نہیں بیٹھ سکتا جس مقام پر وہ پڑھی یا غنا کی جا رہی ہو۔ گرنتھ صاحب میں شمولیت کی بنا پر ہر ہر لفظ نے مقدس بانی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مثلاً امرت سر میں سکھوں کی مقدس ترین عبادت گاہ، شری ہری مندر (گولڈن ٹمپل) میں فرید کے وہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں، اور احترام سے سنے بھی جاتے ہیں، جن میں لوگوں کو نماز ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ فرید نے اسی طرح دوسرے موضوعات اگرچہ مسلم روایات ہی کے مطابق اور مسلم اصطلاحوں میں بیان کیے ہیں تاہم وہ اپنے اندر ایک عالمی کشش بھی رکھتے ہیں اور اسی عالمی کشش کے پیش نظر اس عظیم درویش کا کلام انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس مقدس صحیفے میں کسی فرقہ وارانہ خیال کو در آنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے لیکن ایک قابلِ لحاظ امر، جس کا ادراک سکھ حلقوں میں بھی شاید کم ہی لوگوں کو ہوگا، گرو کی وسعت نظر ہے، جس نے تمام اعلا و ارفع مذہبی تجربات کو، جہاں کہیں سے بھی وہ مل سکے، سمیٹ لیا اور انتخاب میں جو کچھ شامل کیا گیا ان سب کو یک ساں احترام و تقدس بھی عطا کیا گیا۔ اس اعتبار سے سکھوں کے عقیدے کا اور سکھوں کے دینی صحیفے کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جسے پورے طور پر اگرچہ محسوس نہیں کیا جا سکا ہے، تاہم موجودہ فرقہ وارانہ منافرت کے دور میں یہ حد درجہ قابلِ قدر اور انسانیت کے لیے ایک نمونہ ہے۔

'پراتن جنم ساکھی'، گرو نانک کی ایک قدیم ترین خود نوشت سوانح حیات ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ پٹن یا پاک پٹن کے مقام پر گرو نانک کی شیخ ابراہیم سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی، جن کا نام سوانح نگار نے شیخ برہم لکھا ہے۔

ان دونوں نے ہر دو موقعوں پر روحانی موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا اور ایک ساتھ سفر بھی کیا۔ ان سب کی تفصیلات اگرچہ بیان نہیں کی گئی ہیں تاہم ان کا یہ نمایاں پہلو واضح ہے کہ شیخ فرید شکر گنج کے خانوادے کے ایک رکن رکین سے گرونانک کی ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے خاصا وقت شیخ ابراہیم کے ساتھ گزارا تھا۔ یہ بھی قطعی ہے کہ شیخ فرید کی بانی بھی گرونانک کو شیخ ابراہیم ہی سے ملی تھی، جس کی زبان ملتانی پنجابی تھی اور وہ فارسی کے اسی رسم الخط میں لکھی تھی، جس میں تمام پنجابی مسلمان اپنا کلام لکھا کرتے تھے۔ یہ ایک حیرت ناک اور لاینحل معما ہے کہ سکھوں کے علاوہ اور کسی نے شیخ فرید کی تعلیمات کو ان کی اپنی زبان میں محفوظ کرنے کی کیوں کوشش نہیں کی۔ حد یہ ہے کہ پاک پٹن میں بھی یہ دستیاب نہیں ہے جہاں شیخ فرید کی گدی ہے اور جہاں ان کی اولاد کو آج بھی روحانی تقدس حاصل ہے، جس نے خانقاہ اور لنگر کی روایات کو برقرار رکھا ہے۔ اس علاقے میں شیخ فرید کی اولاد کو پشت ہا پشت سے ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے اور آج بھی ہے۔ بہر کیف، اس حیرت انگیز معمے کو حل کرنے کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

گرونانک کو شیخ فرید کا جو بھی عارفانہ کلام، عوامی زبان میں، دستیاب ہوسکا، وہ انھوں نے حاصل کیا۔ فارسی وعربی جیسی عالمانہ زبانوں میں جو کچھ انھوں نے لکھا تھا، وہ گرونانک کے لیے زیادہ کارآمد نہ تھا کیوں کہ دینیات یا فلسفے کے اصولوں کی وہ تدوین کرنا نہیں چاہتے تھے، ان کے پیش نظر تو ایک ایسا مجموعہ مرتب کرنا تھا جو اس انسانی دنیا کے لیے امن و سکون کا حامل ہو جو رنج و محن کی آگ میں جل رہی تھی۔ گرونانک کے گرد و پیش کی دنیا میں نفرت و جہالت، تعصب اور ظلم و تعدی کا دور دورہ تھا۔ اس ماحول

میں عالم انسانیت کو ایک حقیقی مذہب کا اور پاک دلی کا تصور عطا کرنے کے لیے انھوں نے ان تمام وسایل سے کام لیا جو ان کے ہاتھ آسکے۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ ایک ایسی زبان استعمال کی جائے جسے عام لوگ سمجھ سکیں۔ صوفیوں اور سنتوں نے، عالموں کے برعکس، ایسی زبان میں اپنا مافی الضمیر ادا کیا ہے، جسے عوام سمجھ سکتے تھے۔ گرو نانک نے، اور ان کے جانشینوں نے بھی، بڑی دیدہ ریزی سے شیخ فرید کے کلام کا مطالعہ کیا۔ اس کا ثبوت وہ الحاقی اضافے، تشریحی حواشی اور تحسینی کلمات ہیں جو شیخ فرید کی بانی کے بعض حصوں پر، بہ طور ضمیمہ، ان سب نے لکھے ہیں۔ ان کی تفصیلات کا علم اس متن سے ہو سکتا ہے جو گرنتھ صاحب کے اوراق میں محفوظ ہے۔ بعض دوسرے بھگتوں کی بانیوں میں بھی جہاں کہیں گروؤں نے اضافے کی ضرورت محسوس کی ہے، یہی عمل روا رکھا گیا ہے۔ یہ اضافے اس اعتبار سے ایک حیرت ناک کارنامہ ہیں کہ اصل شعری متن پر یہ اثر انداز نہیں ہوئے۔ یقیناً ان کی تدوین کے سلسلے میں پوری احتیاط برتی گئی ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال شیخ فرید کی وہ نظم ہے جو سوہی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس کا پہلا مصرع یہ ہے:

بیڑا بندھ نہ سکیوں بندھن کی ویلا

روحانی زندگی کی طرف سے انسان کی عدم توجہی کا، بڑی دردمندی کے ساتھ، اس نظم میں شکوہ کیا گیا ہے، لیکن براہ راست اور بھونڈے ناصحانہ انداز میں نہیں، بلکہ دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والا ایک ایسا پیرایۂ بیان اس میں اختیار کیا گیا ہے، جو انسان کو اس خطرناک صورت حال سے آگاہ کرتا ہے، جس میں وہ مبتلا ہو گیا ہے اور جس کی مثال اس شکستہ کشتی کی سی ہے، جو ڈوبنے ہی والی ہو۔ شیخ فرید کی اس بانی کا مکمل ترجمہ پیش نظر

کتاب کے آخر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کے بارے میں گرونانک نے بھی اپنے تاثرات اسی بحر اور انہی استعاروں کے ساتھ قلم بند کیے ہیں جسے بخوبی سمجھنے کے لیے مصنف، قارئین کی معلومات کے لیے اپنی کتاب

GURU NANAK - His Personality and Vision

کے صفحہ 59، 60 سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرنا چاہے گا:

"اس نظم کا مسحور کرنے والا حُسن ـــ جس کی سحر آفرینی اور دل کشی ترجمے کی متحمل نہیں ہو سکتی ـــ گرو کے ہمہ وقت بیدار ذہن کو اپنے مطمح نظر سے منحرف نہیں کر سکتی تھی۔ شیخ فرید کے لہجے میں انھیں قنوطیت کا غلبہ نظر آیا۔ کبھی نہ کبھی انسان کا مرنا تو برحق ہے، لیکن وہ کسی وقت بھی خدا کے در کو کھٹکھٹا کر خدا کی طرف واپس آسکتا ہے۔ نیک اعمال کبھی ضایع نہیں ہوتے۔ اس نوع کا ہر عمل، مروّجہ ہندوستانی اصطلاح کے مطابق، انسان کے اعمال نامے میں درج ہو جاتا ہے۔ یہ اگر ہوائے نفس کی آلودگی سے یک سر پاک ہو تو روح کا جزو بن کر اس کی پیدائش کے چکّر کو بڑھا دیتا ہے یا ختم کر دیتا ہے۔ فرید کی نظم میں مستقبل کی جنت یا دوزخ کا اسلامی تصوّر بھی واضح طور پر موجود ہے۔ گرو نے اس کے تکملے کے طور پر خدا کی ذات میں لامحدود یقین کے ایک لبریز مصلحانہ جام کا اضافہ کیا۔ گرو کی مندرجہ ذیل نظم بھی شیخ فرید ہی کی طرح سوہی کی بحر میں لکھی گئی ہے، جو آدی گرنتھ کے صفحہ 721 پر ملتی ہے:

اپنی کشتی کو، سلامتی سے کنارے لگانے کے لیے، گیان
دھیان اور نفس کشی سے مسلح کرو؛
ایسی کشتی کے لیے جھیل ایسی بن جائے گی، جیسے اس کا
وجود ہی نہ ہو؛
نہ تو طوفان اٹھیں گے، نہ پار کرنے میں کوئی خطرہ رہے گا؛
تیرے نام نے، اے میرے محبوب! میرے لبادے کو گہرے
رنگ میں رنگا ہے؛
جو رنگ تو نے مجھے عطا کیا ہے، وہ گہرا ہے؛
محبوب کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میں نکلا ہوں؛
کیا اسے میں کبھی دیکھ سکوں گا؟
دل میں طلب صادق ہو تو وہ آن ملے گا؛
جنھوں نے اپنے وجود کو خدا کی ذات میں گم کر دیا ہے، وہ
مایوس نہیں کیے جائیں گے؛
وہ خالق حقیقی آواگون کے چکر کو ختم کر کے مشتاق روحوں
کو دائمی طور پر اپنے قریب رکھے گا؛
جو لوگ خودی سے نجات حاصل کر لیتے ہیں، ان کے ملبوس
مقبولِ خدا ہوتے ہیں؛
وہ خدا کے پیام کے پھل کو چکھ سکیں گے؛
خدا کا پیام ان کے لیے امرت بن جائے گا؛
کہو نانک : میرے دوستو! مالک حقیقی ایک شیریں محبوب ہے؛
ہم سب اس کے چاکر ہیں، وہ ہمارا حقیقی آقا ہے۔

"گرو کی نظم میں شیخ فرید کے خیالات منقلب شکل میں پیش کیے گئے ہیں، لیکن اصل نظم کے استعاروں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ جھیل طوفانی نہیں ہے؛ کشتی خطرے میں نہیں ہے؛ فرید کے تصور کے ہلکے زعفرانی رنگ کی جگہ پر، لباس گہرے رنگ کے ہیں؛ محبوب کی منزل تک پہنچنے کا سفر پُر ثمر ہے؛ خدا کا پیام تندو ترش ہونے کی جگہ پر امرت کی طرح شیریں ہے۔ فرید کے یہاں موت کا تصوّر بڑا بھیانک ہے، لیکن گرو کی نظم میں موت ابدی آسودگی کی دنیا میں قدم رکھنے کا 'موکش' (نجات) کا — خدا کے دامن میں پناہ لینے کا پہلا زینہ ہے۔

دسواں باب

شیخ فرید کی شاعری — ایک مختصر جائزہ

شیخ فرید کی شاعری میں زہد و تقویٰ کا، معصیت کی پُراسرار دل فریبی کا، موت کے خوف کا اور اس زیاں کا شدید احساس ملتا ہے جو خدا سے اور حُسنِ عمل سے بے پروائی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ ان کے پیرایۂ بیان میں غیر معمولی توانائی اور اثر پذیری کی قوت ہے۔ بے سود مشاغل میں انسانی زندگی کے الم ناک اسراف کو دیکھ کر ہمدردی اور اُنسیت و محبت کے ملے جلے شفقت آمیز جذبات ان کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے کلام میں اسی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں انسان دوستی کا بھی شدید جذبہ ملتا ہے۔ انسان کی حالت کو دیکھ کر ان کے اندر بالکل اسی طرح ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جیسے کوئی آنکھوں والا شخص دیکھ رہا ہو کہ ایک نابینا کسی بلند چٹان پر کھڑا ہے اور عنقریب ایک جان لیوا چھلانگ لگا کر عدم کی راہ اختیار کرنے والا ہو۔ ایک سلوک میں انھوں نے کہا ہے:

فرید! موت اسی طرح نظر آرہی ہے، جیسے دریا کا دوسرا
کنارہ نظر آتا ہے؛
کہا جاتا ہے کہ اس پار شعلہ زن دوزخ ہے اور کانوں کے

پردے پھاڑ دینے والی چیخیں گونج رہی ہیں؛
کچھ لوگ ہیں جنھیں اس کا احساس ہے؛
بہت سے ہیں جو ناعاقبت اندیشی میں گھرے ہیں؛
یہ جان لو کہ اس دنیا میں ہمارے جو اعمال ہوں گے، وہ دوسری
دنیا میں ہمارے خلاف گواہی دیں گے؛

شیخ فرید کا پیغام ہے عفو، عجز اور خوش سلوکی۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کا دل ایک ایسا قیمتی ہیرا ہے جسے لاپروائی سے نہیں، پیار و محبت سے ہاتھ لگانا چاہیے۔ یہ دیکھ کر انھیں دکھ ہوتا ہے کہ روحانی جہالت میں بسر کی ہوئی زندگی کا بوجھ لادے ہوئے بڑھاپا سر پہ کھڑا ہے۔ یہ خیال ان کے بہت سے اشعار میں ملتا ہے۔

شیخ فرید کی شاعری میں انسانی دکھ درد کی جو عکاسی ملتی ہے، عظیم شاعری کے علاوہ، شاید ہی اور کہیں اس کی دوسری مثال مل سکے۔ ان کی زبان اگرچہ جنوبی مغربی پنجاب کے دیہاتوں کے مستند محاوروں کی زبان ہے، جہاں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا تھا، تاہم یہ ان کی شاعرانہ قوت تخیل کا اعجاز ہے کہ یہی زبان ان کے یہاں لطیف کشش، نزاکت خیال اور تخیل کی پرواز سے لبریز نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں مدھم سروں کی موسیقی ہے جس کے لہجے کا زیر و بم دلوں میں ندامت، عفو اور رحم کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ شیخ فرید، جیسا کہ اس کتاب میں کہیں اور بھی کہا گیا ہے، حقیقی معنوں میں پنجاب کے سپوت تھے۔ ان کے کلام میں بھی پنجاب کے دوسرے صوفی شاعروں اور مصلحین اخلاق کی طرح، عام استعارے ملتے ہیں ـــــ گاؤں کا کنواں، گاگر، پانی بھرنے والیوں کی قطاریں، تالاب کے

کنارے بگلے کی اُچک پھاند، گاؤں کی لجائی ہوئی عورتیں، بابا ب ندی، کسم کا ہلکا رنگ — اور یہ وہ استعارے ہیں جو اس سارے علاقے کی سیکولر شاعری پر چھائے ہوئے ہیں۔

شیخ فرید کی بانی کا انگریزی سے ترجمہ اس کتاب کے آخر میں درج کیا گیا ہے، قارئین کو اس کا مطالعہ احترام اور توجہ کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس جگہ اختصار کے ساتھ اس کے موضوعات بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا جو پوری کتاب کے مطالعے کا نچوڑ ہیں سمنا جاتیں اور سلوک چوں کہ مختلف لمحات میں الہام ہوئے ہیں، اس لیے ان میں نہ تو کوئی تسلسل ہے اور نہ موضوعات کے اعتبار سے ان کی شیرازہ بندی ہی کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، یا اسی کی وجہ سے، اس مختصر سے مجموعے میں انسانی ذہن کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی زبردست قدرت ہے۔ شیخ فرید کے کلام کو جب موسیقی کے اُن موزوں سازوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جو پنجاب کے دیہاتوں میں رائج ہیں، تو اس میں بے پناہ دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان کا دل پاک آنسوؤں سے دُھل جاتا ہے اور وہ تقدیس پیدا کرنے والے تجربات سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ تجربہ عام سکھوں کے اُن مذہبی اجتماعات میں ہوتا ہے، جہاں مقدس صحیفے، گرنتھ صاحب کے اکھنڈ پاٹھ کے دوران یہ بانی بھی سنائی جاتی ہے۔ گرنتھ صاحب کے جو انتخابات مرتب کیے جاتے ہیں، جنھیں پوتھی یا سکھوں کی کتاب عبادت کہا جاتا ہے، ان میں بھی شیخ فرید کے کچھ سلوک (اشلوک) ضرور شامل کیے جاتے ہیں۔ ان پوتھیوں میں گردوں کے کلام کے دوش بدوش بھگت کبیر کے اقوال کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ اس طرح سے ہر وہ

لفظ جو گرنتھ صاحب میں داخل کیا گیا ہے سکھوں کے لیے یک ساں احترام کا حامل ہے۔

مقدس صحیفے 'گرنتھ صاحب' میں شیخ فرید کی بانی، ضخامت کے اعتبار سے، مختصر اور پوری کتاب کے صرف دس صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کی وجہ یقیناً یہ ہوگی کہ گرو صاحب کو صرف ان کا اتنا ہی کلام پاک پٹن سے مل سکا ہوگا۔ شیخ فرید کی بانی کا حقیقی موضوع دنیا سے اور دنیا کی مصنوعی دل کشی سے بے تعلقی ہے جسے ہندوستان کی فلسفیانہ اصطلاح میں ویراگ (براگ) کہا جاتا ہے۔ روحانی ترقی کا اور انسان میں خدا کی تکمیل کا پہلا زینہ ویراگ یا دنیا اور دنیا کی مصنوعی دل کشی عدم رغبت ہی ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسی کو توبہ یا بازگشت کہتے ہیں۔ شیخ فرید کے یہاں یہ جذبہ عجز کے اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے خاتمے پر موت کی آمد برحق ہے، جو یکایک اسی طرح نمودار ہوگی جیسے جھیل کے کنارے لاپروائی سے پھدکتی ہوئی چڑیا پر باز جھپٹتا ہے۔ ان کے یہاں خدا کے محبوب بندے ان پرندوں کی طرح ہوتے ہیں جو ویرانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور سنگریزوں میں سے اپنی غذا چنتے ہیں، تاہم خدا سے منھ نہیں موڑتے (سلوک 101)، یا پھر ان کی مثال اس ہنسی کی سی ہے جو اس دنیا کی موٹی چھوٹی چیزوں کو چھونا بھی گوارا نہیں کرتا (سلوک 64، 65، 66)۔ اسی نوع کی ایک تشبیہ کوئل کی بھی ہے، جس کا سیاہی مائل رنگ اپنے محبوب ـــــ یعنی خدا ـــــ سے جدائی کے غم کا پرتو سمجھا جاتا ہے۔ ایک دوسرے سلوک میں اس جدائی کے احساس ہی کو ایک با اقتدار بادشاہ سے تشبیہ دی گئی ہے، اور جو دل اسی احساس سے تہی ہو اسے شمشان بھومی کہا گیا ہے (سلوک 36) دوسری مؤثر تشبیہیں

جو سلوک 98 نیز 100 میں ملتی ہیں، انسان کے دل میں، خود اپنی بداعمالیوں کے احساس کی وجہ سے، کپکپی پیدا کرتی ہیں۔ ان سلوکوں میں انسانی زندگی کے قیمتی ماہ و سال کی بربادی پر خوف، ترس اور افسوس کا ملا جلا قومی تاثر پیش کیا گیا ہے۔

صوفیوں کے اخلاقی و روحانی ارتقا کے سلسلے میں اعتراف عجز، ترک دُنیا اور انسان دوستی بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ذکر اکثر سلوکوں میں ملتا ہے۔ اس ضمن کے سب سے مؤثر آخری سلوک 129 اور 130 ہیں جن میں ہر انسانی قلب کے ساتھ خواہ وہ اذنا ترین انسان ہی کا کیوں نہ ہو، شفقت آمیز ہمدردی برتنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ شیخ فرید کے عالمی اخلاقی اصولوں نے ان کی سطح اس درجہ بلند کر دی ہے کہ وہ صرف مسلمانوں ہی کے یا کسی اور مخصوص فرقے کے نہیں بلکہ بلا تفریق مذہب و ملت، تمام عالم انسانیت کے مصلح بن گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں اسلامی اصطلاحیں ملتی ہیں۔ مثلاً اکثر سلوکوں میں وہ نماز ادا کرنے کے لیے لوگوں کو آواز دیتے ہیں، تاہم ان کی یہ آواز کسی مخصوص فرقے کی عبادت کی دعوت نہیں ہے، بلکہ یہ دعوت ہے، بلا تفریق مسلک زہد اور صفائے قلب پیدا کرنے کی۔ اسی طرح بعض دوسرے سلوکوں میں مثلاً سلوک 19، 33، 61 اور 88 میں عالمی مذہب کا ایک اعلا تصور پیش کیا گیا ہے۔

ان سلوکوں میں کہا گیا ہے کہ خدا ویران اور سنسان جگہوں پر نہیں ملتا، وہ تو متلاشی کے دل میں رہتا ہے۔ انسان کو ایسا مسلک اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو تالاب کی طرح تنگ و محدود نہ ہو بلکہ جھیل کی طرح وسیع اور کشادہ ہو۔ حقیقی درویش وہ نہیں ہے جو سیاہ لبادا پہن کر درویش نظر آنے

کی کوشش کرے، بلکہ سچا درویش وہ ہے جس کی زندگی صاف وشفاف ہو۔
خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عقل کو خاموش کردیا جائے جو
روح میں اضطراب برپا کرتی رہتی ہے، اور کان کو بھی دنیا کی آوازوں کی
طرف سے بند کرلینا چاہیے۔ بعض سلوکوں میں اعلا اور گہری اخلاقی قدروں کا
بیان ملتا ہے۔ مثلاً سلوک 23 میں بڑے مؤثر انداز میں کہا گیا ہے کہ کیکر میں
انگور نہیں لگ سکتے اور کھردرے اون سے نرم ولطیف ریشم نہیں نکالا جاسکتا۔
دوسرے سلوکوں میں عفو اور عدم ایذا رسانی پر زور دیا گیا (سلوک 70، 84)
فوت شدہ لوگوں پر—— فوت شدہ والدین پر—— گہرے رنج وغم کا اظہار
کیا گیا ہے: کہاں ہیں وہ لوگ؟ اور خود تم مرنے کے بعد کہاں ہو گے؟

روحانی اہمیت کے حامل ہونے کے باوصف بعض سلوکوں کا اندازِ بیان
خالص شاعرانہ ہے۔ ان میں جو کچھ استعاروں میں کہا گیا ہے، ایسے سادہ
نثر میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر کسی کا ذہن ان وارداتوں سے مطابقت
نہ رکھتا ہو تو یہ سلوک اسے چیستاں معلوم ہوں گے۔ سلوک 6، 7 اسی نوع
کے ہیں جو راگ آسا یا راگ شبدا کے زیرِ عنوان ملتے ہیں اور اس جگہ تمام
وکمال پیش کیے جانے کے قابل ہیں:

سن اے انسان! وقت پر تو اپنی کشتی کے بادبان کی تونے
مرمت نہ کی،
اب یہ اس جھیل کو کیوں کر پار کر سکے گی جس میں طوفان اُٹھ
رہے ہیں!
عیش وعشرت کیسو کے پھول کی طرح گریز پا ہے، جسے چھوتے
ہی تو جل جائے گا، اس کو ہاتھ نہ لگا پیارے! کہیں یہ

پژمردہ نہ ہو جائے۔
یہ نازک روح مالک حقیقی کے درشت کلمات سن کر لرز رہی ہے۔
جوانی گزر چکی ہے، اب چھاتی دودھ سے دوبارہ لبریز نہیں ہو سکتی۔
پُر محبت ہم آغوشی اب کبھی نصیب نہ ہوگی؛
فرید کہتا ہے، سنو اے میری روح کی بہنوں!
زندگی کا راج ہنس ایک دن آخری اُڑان بھرے گا،
اور یہ جسم مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جائے گا۔

سلوک 10، 107، 112 میں بھی مذہبی زندگی کے عمیق راز پنہاں ہیں۔ ان میں سے پہلے کا موضوع تیاگ اور ترکِ دنیا ہے (موٹا اونی لباس اختیار کرو،) دوسرے میں وجود الٰہی کا ادراک ہے (تم نے خدا کو فراموش کر دیا ہے، لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمھیں نہیں بھولا ہے)۔ آخری سلوک میں روح پر کسی لطیف قوت کے نزول کا احساس ہوتا ہے۔

اخلاقی زندگی کی راہ سخت ریاضت کی اور شدید نفس کشی کی راہ ہے۔ سلوک 60 میں اِن خدا پرستوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ان درختوں کی طرح صابر و شاکر ہوتے ہیں، جو خاموشی سے اپنے کو کلہاڑے کے حوالے کر دیتے ہیں؛ سلوک 115 تا 117 کا عظیم موضوع انتہائے صبر و رضا ہے، جو اخلاقی ترقی کی راہ میں اہمیت کا حامل ہے۔ سلوک 125 میں حرص و ہوا کے جال میں مرغ روح کے پھنس جانے کے خدشات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان موضوعات کے بارے میں شیخ فرید کے جو تاثرات ہیں وہ اس زندگی کے وسیع تر تجربات پر مبنی ہیں جو بلند آدرشوں کے مطابق بسر کی گئی تھی۔

اسی طرح سلوک 30 میں جو خیال پیش کیا گیا ہے، وہ ہندوستان کی

روحانی شاعری کے مزاج کے عین مطابق ہے، جس میں متجسس روح کو فراق کی ماری ہوئی عورت (برہن) کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ خیال عجیب سا ہے مگر ممکن ہے غلط نہ ہو کہ اس بانی کے بعض حصوں میں عظیم تارک الدنیا صوفی، اور خدا پرست معلم اخلاق بابا فرید کی خود زندگی کی جھلکیاں بھی ہوں، جو خدا کی جستجو میں عالمِ انسانیت کی محبت کی مختلف راہوں سے گزرے تھے۔

شیخ فرید کی زندگی کے بعض مستند حالات ان کے سلوکوں کے استعارل سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً سلوک 28 میں روٹی — لکڑی کی روٹی — کا (مثال کے طور پر) ذکر ملتا ہے۔ سلوک 44 میں نمک کو بھی سامان تعیش میں شمار کیا گیا ہے۔ سلوک 19 اور 93 میں شدید ریاضت سے پیدا ہونے والی ناتوانی کا ذکر کیا گیا ہے اور ٹھونٹ مارنے والے کوّے سے کہا گیا ہے کہ کم ازکم میری آنکھوں کو تو چھوڑ دو "تاکہ میں اپنے محبوب کے دیدار سے محروم نہ رہوں"۔ بعض سلوکوں میں شاعر انتہائی ضعیف العمر نظر آتا ہے اور یہ تصویر شیخ فرید ہی کی ہے جنھوں نے 95 سال کی عمر پائی تھی۔ بہرکیف یہ بانی، عام معنوں میں، خود نوشت ہو یا نہ ہو، ایک انتہائی قیمتی خزانہ ضرور ہے جس میں بلند اخلاقی تجربات بھرے ہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جو انسانی دنیا میں شاذونادر ہی کسی کے حصے میں آتی ہے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔

گیارھواں باب

تصوّف اور اُس کی روایات

ابتدا اور ہندوستان میں اس کا ارتقا

تصوف باطنی علم کا دوسرا نام ہے، جس کے فلسفے نے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک وسیع اسلامی دنیا میں ارتقا کی بھرپور اور شان دار منزلیں طے کیں اور جن ملکوں میں، نیز جن قوموں میں، تصوّف کا عقیدہ جڑ پکڑ چکا تھا وہاں اس کی مروجہ شکلوں پر یہ اسلامی تصوّف اثر انداز بھی ہوا۔ تصوّف کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے عظیم شاعری پیدا کی، خصوصاً ایران میں، نیز ان تمام ملکوں میں جہاں آہستہ آہستہ فارسی زبان سے واقفیت نے شاعروں میں اور عوام میں براہ راست یا بالواسطہ اپنی جگہ بنالی تھی۔ متصوفانہ شاعری اسلامی ثقافت کا ایک تاب ناک پہلو رہی ہے، اور اس کی صدائے بازگشت دنیا کی ان گنت زبانوں میں سُنی جا سکتی ہے جس کے بولنے والے اسلام کے پیرو ہیں اور مشرق بعید کے ملکوں ۔ بنگلہ دیش، ہندوستان و پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے اُن ملکوں تک میں پائے جاتے ہیں جو افریقہ کے کناروں تک پھیلے ہیں۔ اس متصوفانہ شاعری کے دائرے میں لاتعداد زبانوں اور بولیوں کی مذہبی شاعری کے علاوہ عطار، رومی، حافظ، عراقی، غنی

اور عرفی جیسے فارسی گویوں کا عمیق فلسفیانہ کلام بھی شامل ہے۔

عظیم ترین متصوفانہ شاعری اگرچہ فارسی میں ملتی ہے اور اس کے اصولوں کو ایران و عرب کے جید عالموں نے فارسی و عربی زبانوں میں آخری اور قطعی شکل دی تھی، تاہم ہندوستان میں بھی اس کے عقاید کی ترویج و اشاعت کے پورے پورے مواقع حاصل رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مدّت مدید سے ہندوستان کے جغرافیائی حدود روشناس عالم رہے ہیں۔ یہی بات ہندوستان کے پڑوسی ملک افغانستان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ علماء دین تو شریعت کے دقیق مسائل کی موشگافیوں اور مناظروں میں لگے تھے، لیکن عام لوگ صوفیا کی قائم کردہ خدا پرستی کی اُن روایات سے روحانی زادراہ حاصل کرتے رہے جن میں شریعت کی بنیادی تعلیمات سے سرمو بھی انحراف نہ تھا۔ صوفیا نے دین داری کی ایک نئی راہ نکالی جو نظری اسلام کے متوازی چلتی تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صوفیا نے نہ تو کبھی اسلامی تعلیمات سے اپنا ناتا توڑا اور نہ اسلامی تعلیمات سے وہ اس قدر دور ہی ہوئے کہ راسخ العقیدہ لوگ انھیں مسترد کر دیتے۔ شاید ہی کسی صوفی نے کوئی ایسی راہ اختیار کی ہو جسے اسلام کے مسلّمہ عقیدے سے یک سر انحراف کہا جا سکے۔ اور جہاں کہیں اس نوع کا کوئی واقعہ پیش بھی آیا، وہاں تقلید پرستوں نے اس کی انھیں پوری پوری سزا بھی دی۔ اس کی مثال منصور الحلاج کا واقعہ ہے، جن کا سر نویں صدی عیسوی میں بغداد میں قلم کیا گیا تھا۔ اس کی دوسری مثالیں شمس تبریز اور سرمد ہیں۔ اوّل الذکر کو تیرہویں صدی عیسوی میں اور مؤخر الذکر کو 1661ء میں دہلی میں مقلدین نے ان کی غیر مقلدانہ روی کی سزا دی۔ بایں ہمہ عدم تقلید کے جرم میں شہید کیے جانے والے صوفیوں کے ساتھ عوام الناس نے ہمیشہ اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا

ہے، انھیں ولیوں کی صف میں جگہ دی ہے۔ ساری اسلامی دنیا میں، اور ان حلقوں میں بھی جو مسلم روایات اور مسلم ثقافت سے کسی حد تک متاثر ہوئے ہیں، منصور کو اولین جویائے حق، صاحبِ اسرار بزرگ اور لاثانی شہید مانا جاتا ہے۔ اس سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں تصوّف اس حد تک اپنی جگہ بنا چکا تھا کہ اس تضاد کو انھوں نے نظرانداز کیا جو تقلید پرستی اور صوفیانہ عدمِ تقلید میں پایا جاتا ہے اور جس میں ایک طرح کی قلندریت کا بھی شائبہ ہوتا ہے۔ بہرکیف اس تضاد کو عوام الناس نے اپنے جذباتی ردِعمل کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا۔ اسلام کے مقلد پیشواؤں کے دوش بدوش مختلف مدارج کے اور مختلف مسلکوں سے تعلق رکھنے والے صوفیا بھی تقریباً ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک مسلمانوں کی امامت اور ان کی روحانی پیشوائی میں حصہ بٹاتے رہے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کے مختلف گروہوں سے ان کا تعلق رہا ہے۔

ہندوستان میں تصوّف گیارھویں صدی عیسوی میں اس وقت داخل ہوا جب غزنویوں نے پنجاب کو اور اس کے نواحی علاقوں کو فتح کیا۔ اس کے بعد کچھ ایسے تاریخی عوامل پیدا ہوئے، جن میں بے دین منگولوں کا عروج سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے، جنھوں نے سمرقند و بخارا سے لے کر بغداد تک مسلمانوں کو ہراساں کردیا تھا۔ ان ہی عوامل کے جلو میں پڑوسی ملکوں سے علماء و مصلحین ہجرت کرکے ہمارے دیس میں آئے، جہاں انھیں امن وامان، استحکام اور رواداری ملی۔ اس طرح سے تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل ہی میں اسلامی علوم اور صوفیانہ ریاضت کے مرکز لاہور، ملتان اور سرہند سے لے کر ہریانہ اور دہلی تک کے علاقوں میں قایم ہوگئے۔ صوفیا کی ابتدائی نسلوں نے اس فارسی ثقافتی ماحول کو بڑی حد تک

برقرار رکھا جس میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی لیکن ان کی بعد کی نسلیں ہمارے سماجی ماحول کی عادی ہو گئیں۔ وہ ہمارے ملک کی زبانیں بولنے لگے اور اپنا پیغام بھی عام لوگوں ہی کی بولی میں ان تک پہنچانے لگے۔ شاعری بھی انھوں نے اسی زبان میں کی جسے عام لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایسے استعارے ایجاد کیے اور ایسا انداز بیان اختیار کیا، جو ہماری ملکی سرزمین کے رنگ میں رنگا ہوا تھا، تاہم انھوں نے اپنی شاعری میں نہ تو اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا اور نہ اس صوفیانہ فلسفے ہی کے دامن کو ہاتھ سے جانے دیا جسے عظیم مفکّروں نے عرب اور ایران کی روایتوں کے سانچوں میں ڈھالا تھا۔

ہندوستان کے صوفی مصلحین نے ہندوستانی یوگیوں اور بھگتوں سے بھی تبادلۂ خیال کیا اور انھوں نے اپنے اپنے روحانی تجربات ایک دوسرے کو بتائے، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جن صدیوں میں اسلام نے ہندوستان میں جڑیں پکڑیں ان ہی صدیوں میں یہ یوگی اور بھگت بھی لاتعداد دُرگوں اور طبقوں میں اور مختلف روایتوں کے حامل گروہوں میں بٹ گئے۔ اس روحانی لین دین نے متعدد سطحوں پر ایک ایسے مرکب کو جنم دیا جو بعض حالتوں میں تو طرفین کے بنیادی اصولوں پر اثر انداز ہوا، اور بعض حالتوں میں اس کا صرف سطحی اثر رہا۔ لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے، وہ تمام روایتوں کی اصطلاحوں کو اور اُن کے روحانی تصورات کو قبول کرتے رہے، اور روحانیت و اخلاقیات کے مشترک تصور سے آشنا ہوتے گئے۔ بااِیں ہمہ تمام حالتوں میں انھوں نے اپنی حقیقی روایتوں کی اُن امتیازی خصوصیات کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، جو سب کے لیے یک ساں کشش رکھتی تھیں۔ چنانچہ صوفیا نے مذہبی ارتقا کے عمل میں حصّہ لے کر ہمارے عوام کے سامنے

ایک ایسا مربوط روحانی تصور پیش کیا جو مذہبی معاملات میں ہمارے قومی زاویۂ نگاہ کا سنگِ بنیاد بن گیا، جس کے نمایاں پہلو رواداری، ہم آہنگی اور انسان دوستی ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہندوستانی صوفیا بھی بھگتوں اور یوگیوں کے دوش بدوش قومی و مذہبی مصلح بن گئے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی صوفیا کی عظیم تعلیمات کا اور ہمارے عوام کی اکثریت پر ان کے ردعمل کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں تصوف کی تاریخ کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے ضروری ہے، جس کا سرسری خاکہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی وساطت سے شیخ فرید کو، ان کی تعلیمات کو، نیز اس امر کے اسباب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ان کی اُس بانی کو، یا ان کے اس مقدس کلام کو، سکھوں کے مذہبی صحیفے میں شامل کیے جانے کا محیر العقول فیصلہ کیوں کیا گیا تھا، جو ایک مخصوص رنگ کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ رواداری اور ہم آہنگی کے پرچار کا بھی ایک ذریعہ رہا ہے۔ شیخ فرید کی بانی کا گرنتھ صاحب میں شامل کیا جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو انسانی عقائد و اعمال کی تاریخ میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔

فلسفۂ تصوف اور اس کی تعلیمات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے سے پہلے صوفی کی اصطلاح کی وضاحت کر دینا مناسب ہوگا۔ اس اصطلاح کے ماخذ کے بارے میں خود اسلامی دنیا میں صدیوں سے مختلف باتیں کہی جاتی رہی ہیں۔ بیشتر حضرات اس خیال پر متفق معلوم ہوتے ہیں کہ اس کا ماخذ 'صوف' ہے۔ صوف اس کپڑے کو کہتے ہیں جو سیاہ کھردرے اون سے تیار کیا جاتا ہے اور جسے عام طور پر مختلف سلسلوں کے صوفی اور درویش پہنتے ہیں۔ یہی شاید اس کا اصلی ماخذ ہے، اور جو لوگ اس کا رشتہ 'صفا' (پاکیزگی) سے، یا 'صفہ' سے (اس صحن سے جہاں پیغمبر اسلام سے قرب رکھنے والے جلسے ہوا کرتے تھے)

جوڑتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہے۔ اس خیال کی تائید 'پشمینہ پوش' کی اصطلاح سے بھی ہوتی ہے، جو ایران میں صوفیوں کے لیے مستعمل ہے۔ گرنتھ صاحب میں شیخ فرید کے جو سلوک ملتے ہیں ان میں بھی اسی ماخذ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ مثلاً 50 کا ترجمہ یہ ہے۔

فرید! وہ لوگ جو کاندھوں پر جانماز لیے پھرتے ہیں، اور موٹا اون
پہنتے ہیں،
لیکن اپنے دلوں میں خنجر چھپائے پھرتے ہیں اور ان کی بے لگام
زبان جھوٹ اڑاتی ہے۔
ایسے لوگ اوپر سے چمکیلے ہوتے ہیں، مگر ان کی روح سیاہ رات
کی طرح تاریک ہوتی ہے۔

نعتیہ شاعری میں پیغمبر اسلام کو عقیدت مندی کے انداز میں کملی والا کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح نعتیہ لوک گیتوں ہی میں بہ کثرت نہیں ملتی، بلکہ بڑے بڑے شعرا نے بھی اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً اقبال کے یہاں 'بانگِ درا' میں اور ظفر علی خاں جیسے خطیب اور بدیہہ گو کے اشعار میں بھی یہ اصطلاح ملتی ہے۔

ظہور اسلام کے تقریباً دو صدی بعد مسلم درویشوں کے ایک مخصوص گروہ کے لیے صوفی کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ قرآن کی سورۂ واقعہ میں خدا کے خصوصی پرستاروں کو مقربین کہا گیا ہے۔ فارسی میں فلسفۂ تصوف پر پہلی کتاب 'کشف المحجوب' ہے، جسے علی بن ہجویری نے گیارھویں صدی عیسوی میں لکھا تھا۔ علی بن ہجویری جنھیں تصوف کی روح کے ادراک پر پوری قدرت حاصل تھی، انھوں نے تصوف کو برتنے کا اور صوفی ہونے کا ادعا رکھنے والوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس تقسیم کے اعتبار سے حقیقی صوفیوں کے

علاوہ ایک گروہ ایسے جاہل معتقدین کا بھی ہوتا ہے جو اندھی تقلید کرتے ہیں۔ انھیں "المتصوفۃ الجاہلین" کہا جاتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ تو کسی مرشد سے تربیت ہی حاصل کی ہے اور نہ کسی بزرگ کے آگے زانوئے ادب تہہ کرکے یہ معلوم ہی کیا ہے کہ طریقت کی راہ پر کہاں تک جایا جا سکتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی کرنے والے اور خدا کے قرب سے ایک نئی زندگی حاصل کرنے والے حقیقی صوفیوں کے علاوہ تصوف کے دو اور نقلی دعوے داروں کا ہجویری نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک کو انھوں نے "متصوّف" اور دوسرے کو "مستصوف" کہا ہے۔ اوّل الذکر اپنے مجاہدوں کے بَل پر اس مرتبے کے طلب گار ہوتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے ہٹھ یوگیوں کے مانند سوفسطائی اور نقال ہوتے ہیں۔ موخر الذکر تدلیس کرنے والے بناوٹی صوفیوں کا وہ گروہ ہے جو دنیوی منفعت کے لیے صوفیوں کے رنگ ڈھنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ان مستصوفین کے بارے میں ہجویری نے لکھا ہے کہ حقیقی صوفیوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت مگس کی سی ہوتی ہے اور عام انسانیت کے لیے وہ صحیح معنوں میں بھیڑیا ہوتے ہیں۔

ہجویری نے اپنی مشہور عالم تصنیف 'کشف المحجوب' کے ابتدائی حصے میں صوفیوں کے گفتار و کردار پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، جس کے نمایاں پہلو ہیں ذاتِ الٰہی میں محو ہو جانے کی تڑپ، دنیوی مال و منال کو ٹھکرا کر غربت و افلاس کو سینے سے لگانا، قناعت اور راضی بہ رضا رہنا۔ گیتا میں جو کچھ یوگی کے لیے کہا گیا ہے وہ صوفی پر بھی صادق آتا ہے، یعنی اس کی نگاہوں میں مٹی کا ڈھیلا اور سونے کا ڈلا برابر ہوتے ہیں۔ صوفی کی نگاہ بھی ذاتِ الٰہی کے سوا کچھ نہیں دیکھتی۔ ماسوا ذاتِ الٰہی کے جو کچھ ہے، صوفی کے لیے اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ ہے تصوف کا وہ ارتقا، جس نے بڑے بڑے درویش پیدا کیے جنھوں نے

رسمیات کے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں سے بلند ہو کر داخلی روشنی حاصل کی اور روحانی آزمایشوں سے گزرے. صوفی اگرچہ ساری اسلامی دنیا میں پائے جاتے تھے، تاہم اس کے فلسفیانہ پہلو کا سب سے شاندار ارتقا ایران میں ہوا لیکن اس کا جملہ تشریحی ادب عربی زبان میں تھا، جس میں علما ذہنی لین دین کیا کرتے تھے۔

کشف المحجوب میں تصوف کے بہت سے اصول وضوابط قلم بند کیے گئے ہیں، اور یہ صرف وہی نہیں ہیں جو اس وقت تک قطعی شکل میں سامنے آچکے تھے، بلکہ اس میں بہت سی ایسی باتیں بھی لکھی گئی ہیں جو مستقبل کے تصوف کی ان حقیقی روایات کی تخم ریزی بھی کرتی تھیں، جس میں محتاط خطوط پر، شریعت کی راہ سے قریب تر ہونے کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس پر اور روشن خیالی پر زور دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں جن بنیادی اصولوں پر زور دیا گیا تھا ان میں عشق (وجد آفریں ریاضت)، رضا (مرضیٔ الٰہی پر راضی رہنا۔ جس طرح گیتا میں عمل کے پھل سے لاتعلقی ہے) اور ورع (پرہیزگاری، پارسائی) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں. کشف المحجوب میں ان علما کو کوئی باعزت مقام نہیں دیا گیا ہے جو مذہب سے محض نظری دلچسپی رکھتے تھے۔ تصوف کی روایات کا یہ بھی ایک مسلّمہ اصول رہا ہے کہ ظاہری علم اور قلبی واردات کے مابین مختلف مدارج کا امتزاج برقرار رکھا جائے. ایک عظیم المرتبت صوفی یحییٰ بن معاذ الرازی کے اس مقولے کو کشف المحجوب میں تائیدی انداز میں نقل کیا گیا ہے۔

"ان نوع کے انسانوں سے پرہیز کرو — علمائے غافلین (جو اپنے فرایض سے چشم پوشی کرتے ہیں)، فقرا، مداہنین (جن کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے) اور المتصوفۃ الجاہلین (جو تصوف سے

نابلد ہوتے ہیں)"۔
ابن اجمال کی جو تفصیل کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس کے مطابق غافل علما، وہ ہوتے ہیں جو دنیا کو قبلۂ دل سمجھتے ہیں۔ شرع کے معاملات میں آسان راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ ظالموں اور حکمرانوں کی پرستش اور ان کے در کا طواف کرتے ہیں۔ دنیوی جاہ و جلال پر جان دیتے ہیں اور اپنے ذہنی تفوق کے زعم میں زبانی موشگافیوں کرتے رہتے ہیں۔ مزید برآں دین کے محترم مصلحین کی تذلیل اور ان پر ظلم و تعدی کی تائید کرتے ہیں، اور ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔۔۔۔ صوفی ہونے کا جاہل دعوے دار وہ ہوتا ہے جسے نہ تو کسی مرشد کی صحبت نصیب ہوئی ہو اور نہ کسی بزرگ سے تربیت حاصل کرنے ہی کا موقع حاصل ہوا ہو، اور اپنی کور چشمی سے نیلا لباس[1] پہن رکھا ہو۔ کشف المحجوب میں صوفیوں کے بارہ سلسلوں کے نام گنائے گئے ہیں۔ یہ سب گیارہویں صدی تک اپنے اپنے بنیادی اصولوں اور مسلّمات کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کر چکے تھے۔ ان میں سے دو سلسلوں کا ملامت آمیز انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان سلسلوں سے تعلق رکھنے والے تناسخ کے قائل اور دوسرے بدعتی عقائد کے حامل تھے۔
تصوف نے جوں جوں ترقی کی اور اُسے زیادہ سے زیادہ پیرو ملنے لگے تو اس میں سلسلوں کی تعداد ہی کا اضافہ نہیں ہوا، بلکہ ظہور تصوف سے پہلے کے مختلف فلسفوں کے اثرات اور بہت سے اصول موضوعہ بھی اس میں داخل ہوتے گئے۔ صوفیانہ انداز فکر کے جراثیم خود قرآن کی بعض آیتوں میں بھی پائے جاتے ہیں، جن میں دنیوی معاملات و مسائل میں بھی وجود ربانی کا ادراک بڑے

---

[1] صوفیا کا ایک طبقہ جو نیلے رنگ کا لباس پسند کرتا ہے۔

لطیف اور شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور یہی بجائے خود تصوف کی روح ہے، جسے محیط کل کہا جاتا ہے۔ اسلام میں اسی کے دوش بدوش ہستی مطلق کا عقیدہ بھی پایا جاتا ہے اور اسے عقیدے کے اعتبار سے تفوق حاصل ہے۔ مزید برآں خدا سے متعلق شخصی واردات کو اور ماورائے حسیات ادراک کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے، جو رسمی مذہب کے حدود سے اگرچہ خارج ہے، تاہم صوفی کی روح اور اس کے ذہن کی تربیت کرتا ہے۔ صوفیوں نے اس موخرالذکر عقیدے کو اسلام میں داخل کیا، اگرچہ اس کے کلّے قرآن و حدیث کے بعض اجزا سے پھوٹتے تھے۔ ان دونوں عقاید میں صدیوں تک دوسرے اثرات کا بھی اضافہ ہوتا رہا۔ نزول قرآن کے سلسلے میں یہ بات مصدقہ طور پر کہی جاتی ہے کہ خدا کا پیغام یا وحی لے کر جب فرشتہ حاضر ہوتا تو اس کے اور پیغمبر کے مابین صرف دو کمانوں کا، بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ جاتا۔ رسول جب معراج کے لیے گئے تو قرب خداوندی کے حصول کے وقت انھیں چاروں طرف تابانی ہی تابانی نظر آئی، لیکن خدا کے دیدار کی جو تڑپ ان کے اندر تھی، اُس نے کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہ دی۔

سعدی شیرازی نے فارسی میں معراج کا حال نظم کرتے ہوئے خدا کے پیامی جبرئیل کے زبان سے اعتراف کرلیا ہے کہ آسمان پر جاتے ہوئے ایک مقام پر انھوں نے رسول سے کہا کہ

گرز سر موئے برتر پرم
فروغ تجلّی بہ سوزد پرم

اس کے بعد رسول اس مقام تک پہنچے جہاں جبرئیل بھی قدم رکھنے کی ہمت نہیں کرسکتے تھے۔ رسول کے متعلق خود قرآن کا یہ اعلان بھی بلند ترین متصوفانہ

فلسفے پر مبنی ہے کہ "یہ زمین و آسمان بھی پیدا نہ کیے جاتے اگر تمھیں پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا"۔ جنگ بدر، جسے رسول لڑے اور فتح حاصل کی، اس کے بارے میں قرآن کا یہ متصوفانہ بیان کہ "اُس تیر نے (دشمن کو) ہلاک نہیں کیا، جو تم چلا رہے تھے، بلکہ خدا نے ہلاک کیا" (ہشتم 17) دنیاوی معاملات میں مشیت ایزدی کے دخل کی مثال ہے۔ اسی طرح موسیٰ نے سنائی میں جلوۂ خداوندی دیکھا جو ان کی نگاہوں کے سامنے بجلی کی طرح کوند گیا، پھر قرآن کا یہ اعلان کہ "میں تمھاری شہ رگ سے بھی زیادہ تم سے قریب ہوں"۔ وجود ایزدی کے محیط کل ہونے کی یاد دلاتا ہے۔ رسول کے جو اقوال ہیں ان میں سے ایک میں وقتاً فوقتاً خدا سے قریب ہونے کا اظہار کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ کبھی کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب میں خدا سے اتنا قریب ہوتا ہوں کہ نہ تو فرشتوں کو اور نہ کسی پیغمبر کو اتنا قرب نصیب ہوا ہے، خواہ خدا کے وہ کتنے ہی مقرب کیوں نہ ہوں"۔

اس طرح سے قرآن میں ایسے تجربات کا ذکر کیا گیا ہے، جس کی روح متصوفانہ ہے۔ تاہم تصوف نے جوں جوں ترقی کی منزلیں طے کیں اس کا فلسفہ نئے نئے رسوم و آداب سے اور شرع کے لازمی قوانین کے اضافے سے بوجھل ہوتا گیا۔ زیادہ ذکی الحس افراد جو مذہب کی ظاہری شکل پر قانع نہیں رہ سکتے تھے انھوں نے خدا سے قریبی اور شخصی تعلق پیدا کرنا چاہا۔ ان لوگوں نے اس دور میں قدرتاً قرآن ہی سے رہنمائی حاصل کی۔ قرآن اور اسلام کے فلسفے میں تصوف کے جو مضمرات تھے، آگے چل کر ان میں دوسرے فلسفوں نے مزید اضافہ کیا۔ لیکن تصوف قرآن اور شریعت کے دائرے سے کبھی بھی زیادہ دور نہیں گیا۔

تصوف کے نشو و نما کا ایک عمرانی پہلو اگر سامنے رکھا جائے تو ان محرکات کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے گا جو تصوف کی ترقی کی پشت پر کارفرما تھے۔ خلافت راشدہ

کا عہد۔ جسے مسلمانوں کی مذہبی قیادت کی روح کہنا چاہیے، اس کے بعد آٹھویں اور نویں صدی میں جب دنیوی اقتدار اور شان و شوکت کا دور آیا، تو وہ لوگ جنھیں ان باتوں سے دل چسپی نہیں ہوتی، انھوں نے روحانی تجربات کو اپنا میدان بنایا۔ اس کے بعد بہت سے نامی گرامی صوفی پیدا ہوئے، جنھوں نے بڑا نام پیدا کیا۔۔۔ مثلاً ذوالنون مصری، جنید، شبلی، حسن بصری، رابعہ بصری اور بایزید بسطامی۔ پھر جبھی جمالی اسلامی دنیا کو، جس نے بہت بڑے تمدن کو جنم دیا تھا، جب منگول گردی سے دوچار ہونا پڑا، تو تصوف کے دوسرے اور زیادہ شان دار عہد کا آغاز ہوا، جو اپنے نسلی کردار کی خصوصیات کے اعتبار سے ایرانی تھا۔ تصوف کی ترقی کے اس دوسرے دور میں منگولوں کے ظلم و تعدی اور ایران میں غیر ایرانی خاندانوں کی حکم رانی کے پس منظر میں ایرانی متصوفانہ ذہن نے روح کی گہرائیوں کا رُخ کیا اور اس کے نتیجے میں فلسفۂ تصوف کا ایک عظیم نظام اور شاعری کا ایک ایسا ذخیرہ وجود میں آیا جو روحانی تجربات پر مبنی تھا۔ اس کے علاوہ صدیوں تک متواتر ایسے عظیم مصلحین پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے اگرچہ کبھی بھی انحراف نہ کیا تاہم تصوف کی دنیا میں جذباتی تجربات کے حصول کی وہ تڑپ بھی انھوں نے پیدا کی جو فرد کی روح میں ذات برتر میں گم ہو جانے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ گیارھویں صدی کے بعد آنے والی صدیوں میں تو اسلام بڑی حد تک تصوف کے رنگ میں رنگ گیا۔ خصوصیت کے ساتھ عوامی رسوم میں یہ عنصر، مختلف مدارج میں، عموماً غالب رہا ہے۔ اسی پس منظر میں وہ مذہبی ماحول پیدا ہوا جس میں شیخ فرید جو اس کتابچے کا موضوع ہیں، نمایاں ہو کر سامنے آئے۔

ابتدائی عہد سے لے کر آگے آنے والے ادوار تک فلسفۂ تصوف نے ارتقار

کی جو منزلیں طے کیں اس پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوگا کہ اس نوخیز اسلامی مسلک کو جس قدیم ترین فلسفے سے سابقہ پڑا وہ یونانی تھا۔ اس فلسفے نے مسلمان مفکرین کے لیے، جن میں سے بیشتر ترعربوں سے لگاؤ رکھنے والے غیر عرب تھے، اسلامی فلسفے کی تمام اصطلاحیں فراہم کر دیں۔ اشراقیت کا فلسفہ بزنطینی سلطنت میں وسیع پیمانے پر مروج تھا ایران کی ساسانی سلطنت، جو بغداد کی خلافت کی وارث بنی تھی، اس سے بزنطینی حکومت اگرچہ برسرِ جنگ رہی تھی، تاہم ثقافت کے میدان میں وہ اس کے ساتھ ربط ضبط بھی رکھتی تھی۔ چناں چہ اس ماحول میں تصوف نے ایک ایسے علاقے میں ترقی کے مدارج طے کیے جو ثقافت کے اعتبار سے انتہائی یونانی تھا۔

اسلامی تصوف میں عشق کا تصور، ریاضت کے متوازی قوت کی حیثیت سے، ذوالنون مصری اور بایزید بسطامی نے داخل کیا، جنھیں صوفیانہ روایات کا باوا آدم کہنا چاہیے۔ انھوں نے روحانیت کی جستجو کو ایک ایسے محبوب سے وصال کی تڑپ کے مرادف متصور کیا، جو فانی نہیں بلکہ حقیقت ابدی، یعنی خدائے تعالیٰ ہے۔ عشق کے موضوع کو، قدرتاً، ہجر میں وصل کی آرزو سے اور ان تمام جذباتی واردات سے وابستہ سمجھا گیا جو رومانی محبت کے لوازم ہوتے ہیں۔ محبت یا عشق کو، جو دونوں عربی الفاظ ہیں، عظیم ترین انسانی واردات سے تعبیر کیا گیا اور عبادت، پرستش، تقویٰ اور ان تمام چیزوں کے مساوی سمجھا گیا جو معتقدات سے متعلق ہیں۔ دنیا کی ان تمام زبانوں میں جو مسلمان ملکوں میں بولی جاتی تھیں — جن میں ہندوستان و پاکستان بھی شامل ہیں — صدیوں تک عظیم اور دلکش شاعری نے وسیع پیمانے پر ترقی کی جس کے استعاروں کی اور مخصوص طرز ادا کی اپنی جداگانہ دنیا تھی۔ روحانی عشق کی متصوفانہ شاعری میں بھی وہی زبان

اور پیرایۂ بیان اختیار کیا جاتا ہے جو عشقیہ شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی صوفیانہ شاعری کو بھی عشقیہ شاعری سمجھ لیا جاتا ہے۔ راسخ العقیدہ اور کٹر مذہبی حضرات جن اسباب کی بنا پر تصوف پر ناک بھوں چڑھاتے رہے ہیں، ان میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ تصوف میں عشق کا اظہار جن پردوں میں کیا جاتا ہے ان میں سماع اور رقص بھی شامل ہیں، اور اسلام میں ان دونوں باتوں کو بے حد مذموم سمجھا جاتا ہے۔ اس موضوع کو، جو وسیع، دل کش اور لامتناہی ہے، مختصر کرنے سے پہلے تصوف کی چند مستند کتابوں کے اقتباسات پیش کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

محمود شبستانی کی 'گلشن راز' تصوف کی ایک اہم فارسی کتاب ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ اس کے ایک باب میں تصوف کی اصطلاحوں کی تشریح کی گئی ہے جس میں زلف، لب، رخسار، ابرو اور محبوب کے دوسرے اعضا کا ذکر کیا گیا ہے، یہ سب اگرچہ جنسی استعارے ہیں تاہم ان کی روحانی توضیح کی گئی ہے لیکن یہ انداز بیان مسلم شاعرانہ روایات میں رچ بس گیا ہے، اور تقریباً ایک ہزار سال سے بڑی پُر شکوہ شاعری کا منبع رہا ہے۔

اسی سلسلے میں مولوی جلال الدین رومی کی مثنوی کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے، جسے اس بنا پر 'ہست قرآن در زبان پہلوی (فارسی زبان میں قرآن)' کہا گیا ہے کہ اس میں اسلام کی بلند ترین روحانی و اخلاقی تعلیمات ملتی ہیں۔ اس کے ابتدائی اشعار جو ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں اس اعتبار سے مشہور ہیں کہ ان میں عشق کے اُس نو افلاطونی فلسفے کو برتر روحانی طریق کے طور پر، مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، جس میں فرد کی روح اپنی اصل سے جس کا منبع کل اور ابدی ذات ہے، ملنے کے لیے بے تاب نظر آتی ہے اور

اس کے فراق میں گریہ کناں ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند	بانسری سے سنو، وہ کیا بیان کرتی ہے
وز جدائیہا شکایت می کند	اور وہ جدائی کی یوں شکایت کرتی ہے
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند	جب سے مجھے نیستاں سے کاٹا گیا ہے
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند	میرے نالوں کو سن کر عورت اور مرد سب روتے ہیں
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق	مجھے ایسے سینے کی طلب ہے جو فراق سے پارہ پارہ ہو
تا بہ گویم شرحِ دردِ اشتیاق	تاکہ دردِ اشتیاق کی شرح بیان کر سکوں

...

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد	ہر وہ شخص جس کا جامہ عشق سے چاک ہوا ہے
او ز حرص و عیب کلی پاک شد	وہ حرص اور دوسرے تمام عیوب سے پاک ہو گیا ہے
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما	شاد رہ، اے میرے عشقِ خوش سواد
اے طبیبِ جملہ علتہائے ما	جو میرے تمام امراض کا علاج ہے
اے دوائے نخوت و ناموس ما	جو میرے نخوت و ناموس کی دوا ہے
اے تو افلاطون و جالینوس ما	جو میرے لیے افلاطون و جالینوس ہے

...

ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا	جو شخص بھی اپنے محبوب سے جدا ہوا
بے نوا شد، گرچہ دارد صد نوا	وہ بے نوا ہے، چاہے اسکے پاس کتنا ہی کچھ کیوں نہ ہو

...

پر د بال ما کمندِ عشق اوست	ہمارے بال و پر اس کے عشق کی کمند ہیں
مو کشانش می کشد تا کوئے دوست	جو بالوں سے کھینچ کر کوئے دوست کی طرف لے جاتے ہیں

متصوفانہ رجحان کی یہ بھی ایک بنیادی کوشش رہی ہے کہ عشق کا وسیع تر

اور روحانی مفہوم تلاش کیا جائے، جو ذاتِ ابدی سے جا ملنے کی تڑپ کا عینیت کا
اور دل و دماغ کی اعلا صلاحیتوں کے جویائے حقیقت ہونے کا مظہر ہو۔ فلسفۂ تصوف
میں بعض صوفیوں کا ایک عربی مقولہ 'العشق بحرق ماسوا اللہ' اکثر نقل کیا جاتا ہے،
جس کے معنی یہ ہیں کہ عشق ایک ایسی آگ ہے جو اللہ کے سوا باقی تمام چیزوں کو
جلاکر خاکستر کر دیتی ہے۔ صوفیانہ شاعری میں، خصوصاً حمد و نعت میں، خدا اور پیغمبر
اسلام سے ہمیشہ اس طرح اظہارِ محبت و عقیدت کیا جاتا ہے جو عشق کے عام جذبات
کے مماثل ہوتا ہے، لیکن اس جذبے کو اعلا و ارفع اور روحانی قدروں پر مبنی سمجھا
جاتا ہے چناں چہ جذبات محبت کے لوازم، مثلاً جنون کو بھی روحانی قدروں میں
تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اس استعاریت کا ایک اچھا نمونہ فارسی نعت کا یہ
مطلع ہے:

سرسلسلۂ اہلِ جنوں موئے محمدؐ محرابِ عبادت خمِ ابروئے محمدؐ
(محمدؐ کی زلف اہلِ جنوں کے لیے نقطۂ آغاز ہے۔ ابروئے محمدؐ کا خم ان کے لیے محرابِ عبادت ہے)

وہ شعرا بھی جنھیں تصوف کا مبہم ہی سا تصور تھا کٹر تقلید پرستی کے خلاف
قلندریت کا مظاہرہ کرنے کا رجحان رکھتے تھے۔ انھوں نے تصوف کو بسا اوقات
اس طرح پیش کیا گویا وہ رندی کے مماثل ہے۔ یہ رجحان تقلید پرستوں کے لیے
انتہائی نامحمود ہی نہیں، مردود بھی تھا۔ چناں چہ تقلید پرستی سے عدم رغبت کی
بنا پر روحانیت کو کفر کے مماثل سمجھا جانے لگا اور اس کے لیے "کفرِ حقیقی" جیسی
اصطلاح وضع کی گئی، جو اپنی ہیئتِ ترکیبی کے اعتبار سے متناقض ہے۔ لیکن کبھی
بھی کوئی صوفی جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، تقلید کی راہوں سے بہت دور نہیں گیا۔
چناں چہ ہمیشہ صوفیوں کا موقف زہد و تقلید پرستی سے لے کر قلندریت کے مظاہرے
تک رہا ہے، اور یہ سب بنیادی طور پر دائرۂ اسلام ہی میں ہیں۔

بارھواں باب

تصوّف پنجاب میں

پنجاب کی سرزمین ہندوستان کے ان علاقوں میں ہے، جہاں سب سے پہلے تصوف کے اثرات محسوس کیے گئے، اور جہاں بڑے بڑے صوفی مصلحین کو خوش آمدید کہا گیا۔ سابقہ اوراق میں بھی کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ مشہور صوفی بزرگ علی بن عثمان ہجویری نے، جو عام طور پر "داتا گنج بخش" کے لقب سے مشہور ہیں، گیارھویں صدی عیسوی میں لاہور کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ لاہور وارد ہونے سے قبل انھوں نے ایران و عراق میں طویل مدت تک تصوف کی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ اس کا انھوں نے اپنی تصنیف کشف المحجوب میں جگہ جگہ ذکر بھی کیا ہے۔ یہ کتاب انھوں نے غالباً لاہور ہی میں لکھی تھی۔ 431ھ (1045ء) میں وہ لاہور آئے اور وہیں 465ھ (1077ء) میں وفات پائی۔ ان سے پہلے ایک اور صوفی بزرگ شاہ حسین بھی لاہور کو اپنا مرکز بنا چکے تھے۔ شیخ فرید 600ھ (5-1204ء) میں شیخ علی بن عثمان ہجویری کے مزار پر حاضر ہوئے۔ ان سے پہلے خواجہ معین الدین چشتی بھی 580ھ (1185ء) وہاں حاضری دے چکے تھے۔

اس کتاب میں پہلے بھی کسی جگہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ملتان میں تصوف

کا ایک اہم مرکز بارھویں صدی عیسوی میں قائم ہو چکا تھا۔ ملتان کے اس مرکز کے علاوہ تصوف کے اور بھی متعدد مراکز ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقے میں، جو دہلی تک پھیلا تھا، قائم ہو چکے تھے۔ شیخ فرید نے تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اپنا مرکز اجودھن میں قائم کیا، جس نے آگے والے برسوں میں ایک ایسے عظیم مرکز کی شکل اختیار کر لی، جہاں سے تصوف سارے مغربی پنجاب میں پھیل گیا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پنجاب کے لوگ صدیوں سے تصوف کے بنیادی اور مقبولِ عام پہلوؤں سے آشنا ہوتے رہے ہیں۔ پنجاب میں انسان دوستی کی ریت اور پردیسیوں کی خاطر و مدارات کی روایت عام تھی۔ مذہبی گیتوں کا سنگت میں گایا جانا بھی پنجاب کے دیہاتوں اور شہروں میں یکساں طور پر رائج تھا۔ ہندو مسلم عوام، بلا تفریق مذہب، اپنے مذہبی جذبات کی آسودگی کے لیے، حاجت رواؤں کے لیے اور آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہنے کی دعاؤں کے لیے مختلف سلسلوں کے اور مختلف مرتبوں کے صوفیوں کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ پنجاب نے بڑے بڑے صوفی پیدا کیے جنھیں مصلح اور روحانی رہنما کی حیثیت سے بڑی شہرت و عظمت حاصل ہوئی۔ اسی طرح متصوفانہ رجحان رکھنے والے شعرا نے بھی پنجاب میں جنم لیا، جنھوں نے ایسی مناجاتیں اور مذہبی گیت لکھے جو وجد و جذب کی کیفیت پیدا کرنے والی صوفیانہ خصوصیات کے حامل ہیں[۵]۔ ان پنجابی شعرا نے بہت بڑا شعری ذخیرہ بھی چھوڑا ہے، جسے اونچے اور تعلیم یافتہ طبقے میں اگرچہ دیہی

---

۵ بھائی نند لال جو گرو گوبند سنگھ کے مذہبی اجتماعات میں شریک ہوا کرتے تھے، فارسی گو تھے اور ان کے کلام میں تصوف کا گہرا رنگ تھا۔ ان کے کلام کو سکھ مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے مذہبی اجتماعات میں وہ پڑھا جاتا ہے۔

شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے، تاہم آج بھی وہ پنجابی عوام کے مذہبی عقائد اور روحانی تصورات کا آئینہ دار ہے۔ پنجاب اور اس کے نواحی علاقوں میں تصوّف مقامی ماحول سے بھی بہت حد تک متاثر ہوا۔ یوں تو تصوّف کا فلسفیانہ ادب عربی و فارسی روایات و خیالات کو اپنا ماخذ بناتا رہا ہے تاہم پنجاب کے صوفیا نے اپنی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی اشاعت کے لیے اور حق و صداقت کے پرچار کے لیے پنجابی عوام ہی کے محاورات اور استعارات سے کام لیا۔ ہندو عوام بھگتوں، یوگیوں، سنیاسیوں اور سادھوؤں کی جس طرح تعظیم کرتے، اسی طرح مسلمان فقرا، اور درویشوں کے آگے بھی سرِ عقیدت خم کرتے۔ یہ ان ہی حالات کا نتیجہ تھا کہ روحانی خیالات کے اظہار کے لیے ایک ایسی زبان وجود میں آئی جس کا ماخذ یکساں طور پر ہندوستانی، عربی و فارسی زبانیں تھیں۔ لوگ، بلا تفریق مذہب، سادھوؤں سنتوں کی اور پیروں فقیروں کی کرامات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ان میں اوّل الذکر ہندو مت سے اور مؤخر الذکر مذہب اسلام سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام نے اگرچہ کبھی بھی عقیدے اور شرعی قوانین کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھے، تاہم صوفیا نے اسلامی تصورات کی ترویج و اشاعت میں متشدد رویّہ اختیار نہیں کیا بلکہ وسیع تر انسانی نقطۂ نظر کو پیشِ نظر رکھ کر، بلا تفریق مذہب، ہندو مسلم عوام کے سامنے اخلاقی حقائق پیش کیے۔

ریاضت کے بعض اعمال میں بھی صوفیوں اور یوگیوں یا بھگتوں کے خیالات میں یکسانیت پیدا ہوگئی تھی۔ مثلاً یوگیوں کے "پران یام" (سانس روکنے) کو صوفیوں نے بھی اختیار کیا اور اسے "پاس انفاس" کا نام دیا۔ یوگیوں کی اصطلاح میں "مایا" فریب نظر کو کہتے ہیں، جو ذاتِ مطلق کو روح کی نظروں

سے ادجھل رکھتا ہے، صوفیوں نے اسے "حجاب" (پردہ) سے موسوم کیا۔ صوفیوں کے یہاں وجد کا ــــ روحانی عشق کے پرجوشش اظہار کا ــــ تصور پایا جاتا ہے، ہندوستان میں، اس کے مماثل، جذبات عشق سے لبریز کرشن بھگتی کا تصور پہلے سے موجود تھا۔ چناں چہ صوفیوں نے اس کے لیے بھی اصطلاح وضع کی اور پرستش کی ایک ایسی روش نکالی جو دنیوی عشق سے قریبی مماثلت رکھتی ہے۔ اس نوع کے جذبات کے اظہار کے لیے اگرچہ فارسی کی صوفیانہ عشقیہ شاعری میں ابتدا ہی سے گنجائش موجود تھی، تاہم ہندوستان میں روحانی عشق کے اظہار کے چوں کہ بہت سے اسلوب پائے جاتے تھے اس لیے مقامی اثرات کے تحت اسے یہاں مزید تقویت ملی۔

تصوف اور بھگتی کی تحریکوں کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کا سب سے اچھا مظہر ان دونوں کے انداز بیان اور اعمال کی مماثلت ہے۔ ہندوستان میں (اور پنجاب میں) صوفیوں نے بعض روحانی تجربات کے لیے، یا اپنے عقائد کے اظہار کے لیے دیسی اصطلاحیں استعمال کیں۔ مثلاً خدا کے لیے، محبوب کی حیثیت سے، سجن، پیا اور پریتم کی خالص ہندوستانی اصطلاحیں اختیار کیں۔ اسی طرح انھوں نے 'ہجر' کے لیے 'برہ' کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا۔ کم تر درجے کے صوفیوں کے لیے سائیں کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی، جو سوامی کی عوامی شکل ہے۔ بھگتوں نے بھی صوفیوں سے بہت سی اصطلاحیں مستعار لیں۔ مثلاً محرم، دل دار، جانی محبوب کے لیے اور لنگر مفت خوراک فراہم کرنے کے لیے (ابتدا میں یہ لفظ مسافروں کی جائے پناہ کے معنوں میں مستعمل تھا) پہلے بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ لوگوں نے بڑی رواداری کے ساتھ "رام رحیم" "وید کتاب"، "پران قران"، "ابدالی" اور "قلندر بیشنو" کی مترادف اصطلاحیں

استعمال کرنی شروع کردی تھیں (مؤخر الذکر اصطلاح نام دیو کے یہاں ملتی ہے) یہ انھیں حالات کا نتیجہ تھا کہ تعصب، علاحدگی پسندی اور عدم رواداری کا تیزی سے خاتمہ ہونے لگا تھا

ہندوستان کی عشقیہ ــــ روحانی یا سیکولر ــــ شاعری کی اُس روایت کو بھی صوفیا نے اپنایا، جس میں عاشق یا پرستار کو ایک پُر شوق اور مشتاق عورت کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر، اس طرزِ فکر کا یہ منطقی نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کی عشقیہ شاعری میں محبوب کو ایک ایسے بے نیاز عشق باز کی شکل میں پیش کیا گیا جو "اغیار" سے محو راز و نیاز رہتا ہے۔ دوسری طرف عاشق کو رازدار کی بھی ضرورت ہوئی جسے "سکھی" یا "سہیلی" سے تعبیر کیا گیا۔ ہندوستانی صوفیا نے ہندوستانی شاعری کے ان تمام اسالیب کو اپنا لیا۔ اس کے نمونے شیخ فرید کے یہاں بھی ملتے ہیں، جو بالکل ابتدائی دور کی ہندوستانی صوفیانہ شاعری ہے۔ (دیکھیے راگ آسا نمبر 1، 4، سوہی نمبر 6 مناجات موہی للت، سلوک نمبر 1، 23، 24، 32، 34، 54، 63 وغیرہ)۔ قرونِ وسطیٰ کے ایک مسلم صوفی شاعر نے روحانی عشق کے تجربات کو اس انداز میں پیش کیا ہے:

سُن سہیلی پریم کی باتا یوں مل رہی جوں دودھ نباتا
(اے سہیلی! میری محبت کی بات سُن، محبوب سے میں اس طرح ملی جیسے دودھ میں شکر)

ہندوستانی (بہ شمول پنجابی) صوفیا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اسی دھرتی سے اور اسی دھرتی کے بسنے والوں کی زندگی سے اخذ کیے گئے تھے، جن کے درمیان وہ زندگی گزارتے تھے۔ اس طرح ایک ایسا عوامی

ادب انھوں نے پیدا کیا، جسے دوہری اہمیت حاصل ہے ــــ ایک روحانی تخلیق کی، دوسری عوامی ادب کی پنجابی صوفی شعرا سب کے سب مسلمان تھے[1]۔ ان کے کلام کے پس منظر میں پنجاب کے دیہی علاقوں کی تصویر نظر آتی ہے۔ زرعی معیشت کے دور میں زندگی بسر کرنے والے صوفیا نے اپنے تجربات بیان کرتے وقت ایسے استعاروں سے کام لیا ہے، جو اسی ماحول سے مطابقت رکھتے تھے۔ مثلاً موت کے بعد خدا سے وصال کے لیے وہ اُس دلہن کا استعارہ استعمال کرتے ہیں جو شادی کے بعد والدین کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال جاتی ہے ــــ جسے 'ساہا' کہتے ہیں۔ اسی طرح صوفی شعرا کے یہاں کاتک کے مہینے میں اُڑنے والے کونج کا، ساون کے برق دباراں کا، کنویں کے گرد جمع ہونے والی عورتوں کا، پانی کے گاگر کا، کوئل اور پپیہے کی غم آگیں پکاروں کا، ہاتھ کے دونے سے چھن چھن کر گرنے والے تل کے دانوں کا، کُسم کے ہلکے رنگ کا، روح کی پاکیزگی کا مظہر سمجھے جانے والے ہنس کا، بھینس کے شیریں اور حیات بخش دودھ کا، اور اسی طرح کی دوسری ان گنت باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ متصوفانہ شاعری کے اس پہلو نے عوام النّاس کو صرف روحانی تجربات ہی سے آشنا نہیں کیا، بلکہ ان مقدس ہستیوں کو ان کے دلوں سے بھی قریب تر کر دیا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بلّا شاہ اور شاہ حسین جیسے مسلمان پنجابیوں کے اور شاہ عبداللطیف جیسے مسلمان سندھیوں کے قومی شاعر بن گئے، خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ عوامی سطح کی تلمیحات اور استعارے جو صوفی شعرا نے

---

[1] بعض غیر مسلم شعرا نے بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہ بات گزشتہ ایک صدی یا اس کے لگ بھگ زمانے کے بارے میں خصوصیت سے کہی جا سکتی ہے۔

استعمال کیے ہیں، ان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعری میں وطن کی دھرتی سے بے پایاں محبت کا خزانہ موجود ہے، جس سے ایسی فضا پیدا ہوتی ہے، اور ایسا ماحول جنم لیتا ہے جس میں انسان عقائد کی تفریق کو بھول کر خدا کی محبت، انسانیت اور وجد کی روح پرور دُنیا میں گم ہو جاتا ہے۔

تیرھواں باب

شیخ فرید کا مُلتانی پنجابی کلام[1]

راگ آسا

شروع کرتا ہوں اس برتر ذات کے نام سے جو ناقابلِ تقسیم ہے،
جو اپنے فضل و کرم سے ہی پہچانا جاتا ہے۔
سچے درویش وہی ہیں، جو صدقِ دل سے خدا سے لو لگاتے ہیں۔
جن کے قول و فعل میں تضاد ہو، وہ خام مٹی ہیں۔
عشقِ الٰہی میں ڈوبے ہوئے، حقیقی درویش، تصورِ خداوندی میں
ہمہ وقت مستغرق رہتے ہیں، ان پر وجد کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

---

[1] شیخ فرید کا جو کلام سکھوں کی مقدس کتاب 'گرنتھ صاحب' میں درج ہے، اس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعض اجزا، جن سے اجنبی قارئین کو اُلجھن ہو سکتی ہے، حذف کر دیے گئے ہیں لیکن ہر راگ کے نام کو اور ابتدائی دعائیہ کلمات کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے، جس طرح مقدس کتاب میں لکھے گئے ہیں۔

خدا سے بے پروا رہنے والے زمین پر بوجھ ہوتے ہیں۔ (1)

سچے درویش وہی ہیں، جنھیں خدا اپنے وصال کی دولت عطا کرتا ہے۔
ان کا وجود مبارک اور ان کی زندگی حقیقی معنوں میں کامیاب
ہوتی ہے۔ (2)

اے پروردگار! تو لاانتہا ہے، فہم سے بالاتر ہے۔
جنھیں تیرا وجدان نصیب ہوا، میں ان کے قدم چومتا ہوں۔ (3)

اے خدا! میں تیری پناہ چاہتا ہوں،
تو غفور الرحیم ہے،
شیخ فرید کو اپنی بندگی کی خیرات عطا کر۔ (4-1)

شیخ فرید کہتا ہے، پیارے اللہ سے لگا۔
یہ تن ایک دن ضرور خاک میں ملے گا،
سادہ سی قبر میں دفن کر دیا جائے گا۔ (1)

شیخ فرید! خدا کا وصال آج ہی نصیب ہو سکتا ہے، اگر
نفس کی چیخ و پکار پر تو قابو حاصل کرے جو تیرے دل و
دماغ میں گونج رہی ہے۔ (1)

اس کا احساس اگر ہو جائے کہ موت برحق ہے، جس کے
بعد واپسی ممکن نہیں، تو اس بے مصرف دنیا کے پیچھے
کوئی بھی ابدی زندگی کو برباد نہ کرے۔[1] (2)

بولیے سچ دھرم، جھوٹ نہ بولیے[2]
مرشد کی بتائی ہوئی، راہ پر ہمیشہ مرید کو چلنا چاہیے۔ (3)

بڑے سورما[3] دریا کو پار کر لیتے ہیں۔
انھیں دیکھ کر بزدل عورت کی بھی ہمت بندھتی ہے،
خدا سے بے پروا رہنے والوں میں بھی یہ احساس پیدا ہوتا ہے
کہ ان کے حسین جسم آرے سے چیرے جائیں گے۔ (4)

اے شیخ[4]! حیات ابدی دنیا میں کسی کو نہیں ملی
جس جگہ ہم آسن جمائے ہیں، وہاں کتنے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ (5)

---

[1] شیخ فرید کا اصل مصرع بھی اُردو زبان سے بے حد قریب ہے۔ مصرع یہ ہے:
بولے شیخ فرید پیارے اللہ لگے (مترجم)
[2] شیخ فرید کا اصل مصرع یہی ہے (مترجم)
[3] سورما کا استعارہ عارف کے لیے ہے اور عورت سے مراد کم زور انسان ہیں۔
[4] شیخ کا اشارہ اپنی ہی طرف نہیں، علما کی طرف بھی ہے، جن کے نام کے ساتھ شیخ کے لقب کا اضافہ کیا جاتا تھا۔

کاتک میں اُڑنے والے کونج، چیت میں جنگلوں کی آگ، ساون کی
بجلیاں نہ تو ان میں سے کسی کو ثبات ہے، اور نہ سرما کی
طویل راتوں کی مسرت بخش ہم آغوشی کو[1]
(6)

خوب سمجھ لو! ہر فانی کا یہاں سے جانا لازمی ہے۔
دلوں کو محبت کے تاروں میں پرونا بہت مشکل کام ہے
لیکن ان کے بکھرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔[2]
(7)

زمین نے آسمان سے سوال کیا: اس دنیا سے گزرنے والے عظیم
انسانوں کا کیا حال ہے؟
آسمان نے جواب دیا: اپنے گناہوں کے بوجھ لیے وہ سب قبروں میں
عذابِ خداوندی کے منتظر ہیں۔
(8-2)

—— آدی گرنتھ: صفحہ 588

---

[1] اس سلوک میں، اور دوسرے سلوک میں بھی، زندگی اور اس کی مسرتوں کے عدم ثبات
سے آگاہ کیا گیا ہے۔
[2] اس جگہ متصوفانہ انداز میں عشقِ الٰہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

راگ سوہی

شروع کرتا ہوں اس برتر ذات کے نام سے، جو نا قابلِ تقسیم ہے،
جو اپنے فضل و کرم ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

تپ ہجر میں جل جل کر کفِ افسوس مل رہی ہوں
میرے محبوب! تیری جستجو میں باولی ہو رہی ہوں
تو مجھ سے برگشتہ ہو گیا ہے میرے محبوب
اس میں دوش تیرا نہیں، میرا ہی ہے
تیری قدر و قیمت میں پہچان نہ سکی،
جوانی کھونے کے بعد اب پچھتا رہی ہوں۔ (1)

کالی کوئل! تو اتنی سیاہ فام کیوں ہو گئی؟
پریتم کے برہ کی آگ نے میرے پروں کو جھلسا دیا ہے۔
جو اپنے پریتم سے جدا ہو، اُسے سکھ کہاں
مالکِ حقیقی کی عنایت ہی سے اس کا وصال نصیب ہو سکتا ہے۔ (2)

سنسان کنویں کے کنارے روح تنہا کھڑی ہے،
نہ کوئی ساتھی ہے، نہ کوئی بیلی

خدا ہی کے کرم سے اس کا مقدس وصال نصیب ہو سکتا ہے
ارد گرد نظر ڈالتی ہوں، تو خدا ہی اپنا دم ساز نظر آتا ہے (2)

میری زندگی کی راہ تیرہ و تار ہے — تلوار کی دھار سے زیادہ
تیز، انتہائی تنگ،
اس راہ سے مجھے گزرنا ہے۔
سنو شیخ فرید! روانگی کی اب فکر کرو،
بس اب پو پھٹنے ہی والی ہے۔ (4-1)

راگ سوہی للت

اے انسان! وقت پر تو اپنی کشتی کو تو درست نہ کر سکا
اب جب دریا میں طوفان امڈ رہا ہے، یہ کشتی کیسے پار لگے گی!
عیش کسم کے پھول کی طرح گریزپا ہے[1]
اسے ہاتھ نہ لگانا، اسے چھوتے ہی پیارے تو جل جائے گا۔ (1)

مالک کے درشت لہجے کو سن کر روح کانپ رہی ہے

---

[1] کسم کے پھول سے سرخی مائل رنگ بنایا جاتا ہے، جو دھونے کے بعد صاف ہو جاتا ہے۔ اس پھول کو نزاکت کے لیے استعارے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

جوانی بیت چکی، اب نہ تو تیری چھاتی میں دودھ اتر سکتا ہے، نہ
گرم جوش بغل گیری ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ (2)

فرید کہتا ہے: میری روح کی سہیلیو سُنو!
روح کا پرندا ایک دن پھڑپھڑا کر اُڑ جائے گا
یہ جسم خاک کا ڈھیر بن جائے گا۔ (3-2)

آدی گرنتھ: صفحہ 794

شیخ فرید کے سلوک

دلہن کی رخصتی[1] کا مقررہ دن ٹل نہیں سکتا۔
ایک دن موت کا فرشتہ[2] آئے گا (اور) جسم کو توڑ مروڑ کر روح
کو رخصت کرا کے لے جائے گا۔
اس دن کا آنا برحق ہے، کہہ دو اپنی روح سے کہ وہ دن ٹل
نہیں سکتا۔
روح دلہن اور موت دولہا ہے، جو روح کو رخصت کرا کے اپنے
ساتھ لے جائے گا۔

---

1. رخصتی یعنی موت۔ دلہن روح کو کہا گیا ہے۔
2. اسلامی عقیدے کے مطابق روح سلب کرنے والے فرشتے کو ملک الموت کہتے ہیں۔

روح کو رخصت کر دینے کے بعد جسم کس کے کاندھوں پر سر رکھ کر
روئے گا؟[1]
مرنے کے بعد پل صراط کو پار کرنا ہوگا، جو پانی سے زیادہ باریک،
اور دوزخ پر سے گزرتا ہے، جس کی فضا آہ و بکا کے شور
سے گونجا کرتی ہے
اے فرید سن! وہاں دار و گیر کا ہیبت ناک شور و غل ہوگا،
ناعاقبت اندیشی کا شکار ہو کر اپنی زندگی کو لٹنے نہ دو۔ (1)

شیخ فرید! خدا پرستوں کی زندگی بڑی کٹھن ہوتی ہے۔
میں بدنصیب ہوں، میں نے دنیوی راہ اختیار کی ہے۔
کہاں پھینکوں اس دنیوی بوجھ کو، جو میں ڈھو رہا ہوں! (2)

(ذیل کے سلوک کا خیال سابقہ سلوک سے وابستہ ہے)
دنیا پرستی آتش خاموش ہے، یہ نظروں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔
دنیا سے بے تعلقی کے تحفے کے لیے، مالک کا شکر ادا کرتا ہوں،
ورنہ یہ تو جلا کر مجھے خاک کر دیتی۔ (3)

فرید! اگر معلوم ہوتا کہ زندگی تل کے دانے کی طرح مختصر ہے،
تو اسے صرف کرنے میں احتیاط برتی ہوتی۔

---

[1] اس سلوک کا خیال ہندوستانی شادی کی روایات سے مطابقت رکھتا ہے۔

یہ اگر معلوم ہوتا کہ محبوب اس درجہ بے پرواہ ہے تو نسوانی
خود نمائی کا میں اس درجہ مظاہرہ نہ کرتی۔
(4)

(موضوع جاری)
اگر معلوم ہوتا کہ محبت کا بندھن اتنا کمزور ہے، تو اس قدر
مضبوط گرہ میں باندھتی کہ کبھی وہ ٹوٹ ہی نہ سکے۔
اے مالک! زندگی بھر خاک چھانتے رہنے کے بعد اب یہ منکشف
ہوا ہے کہ ـــ تجھ سے زیادہ کوئی بھی مجھے عزیز نہیں ہے۔
(5)

فرید! تیرے پاس اگر عقل سلیم[1] ہے، تو اپنے اعمال نامے کو
سیاہ نہ ہونے دے۔
گریبان[2] میں منہ ڈال کر اپنے اعمال کو دیکھ!
(6)

فرید! تو ان سے انتقام نہ لے جو مجھ پر حملہ کرتے ہیں، بلکہ ان
کے گھر جا کر تو ان کی قدم بوسی کر۔
(7)

فرید! آخرت کی دولت جمع کرنے کا جب زمانہ تھا، تو تو دنیا
میں گم رہا؛

---

[1] اس جگہ شیخ فرید نے 'لطیف' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔
[2] اس جگہ شیخ فرید نے 'گریوان' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اب موت قریب آتی جا رہی ہے[1]، عمر کا پیالہ جوں ہی لبریز ہو،
روانگی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ (8)

(سلوک 13 تک یہی موضوع جاری ہے)
فرید! تجھے ہوا کیا ہے!
داڑھی کے بال سفید ہو گئے
دوسری دنیا میں جانے کا وقت قریب آگیا
ماضی بہت پیچھے چھوٹ چکا ہے۔ (9)

اے فرید! میری زندگی کی سرگذشت یہ ہے:
شکر سے شیریں تر زندگی زہر سے تلخ تر بن گئی ہے۔
یہ دکھ بھری داستان مالک کے سوا کس کو سناؤں! (10)

فرید! تیری بصارت کم ہو گئی، سماعت جاتی رہی،
یہ جسم پکے ہوئے ڈنٹھل کی طرح رنگ بدل رہا ہے۔ (11)

فرید! جو خدا کو اس وقت یاد نہیں کرتے جب ان کے بال سیاہ
ہوتے ہیں، وہ شاذ ہی اس وقت خدا کی طرف متوجہ

---

[1] اس جگہ جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے لغوی معنی ہیں موت کی جڑیں مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔

ہوتے ہیں، جب اُن کے بال سفید ہونے لگتے ہیں۔
خدا کی یاد اس وقت کرو جب جوانی باقی ہو۔
(12)

(آگے آنے والا سلوک گرو امرداس کا ہے، جو گرونانک کے سلسلے کے تیسرے گرو تھے۔ یہ انھوں نے مندرجہ بالا سلوک پر حاشیے کے طور پر لکھا تھا)

فرید! جب بھی توفیق ہو، خدا کی عبادت کی جا سکتی ہے، اس کے لیے جوانی یا بڑھاپے کی قید نہیں۔
کوشش یا خواہش سے پرستش کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔
خدا جس کو چاہتا ہے، اس کے دل کا پیمانہ اپنی محبت سے لبریز کر دیتا ہے۔
(13)

فرید! میں نے وہ آنکھیں دیکھی ہیں جنھوں نے جگ کو موہ لیا تھا،
جو سرمے کی تحریر کا بار بھی اٹھا نہ سکتی تھیں، آج چڑیاں
ان کو ٹھونگیں مارتی ہیں۔
(14)

فرید! ان پر نہ تو طعن و تشنیع کا اثر ہوتا ہے اور نہ نیکی کے وعظ کا جن کے دل شیطان کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔

فرید! سارے جہان کے مالک کو تلاش کر۔
اپنے پیر تلے کی گھاس کو دیکھ، تو بھی اسی طرح خاکساری

سے کام لے۔ (16)

فرید! خاک کی مذمت نہ کر، اس خاک کی برابری کون کر سکتا ہے!
زندگی میں اسے ہم پیروں سے روندتے ہیں، مرنے کے بعد یہ
ہمارے اوپر ہوتی ہے۔ (17)

فرید! عشق و ہوس کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ ہوس عشق کو ناپاک
بنا دیتی ہے۔
ایسی محبت اس چھپر کی سی ہوتی ہے جو بارش میں ٹپکتا ہے۔ (18)

فرید! جنگل جنگل پھرنے سے کیا حاصل! خاردار جھاڑیوں کو
روندنے سے کیا فائدہ!
اب تو تیرے دل میں موجود ہے، اسے جنگلوں میں کیوں
ڈھونڈتا ہے! (19)

فرید! ایک وہ زمانہ تھا جب یہ دبلے پتلے پیر کوہساروں اور
ریگ زاروں کو روندتے پھرتے تھے۔
ایک یہ زمانہ ہے کہ وضو کا کوزہ[1]، جو قریب ہی رکھا ہے، سیکڑوں
کوس دور معلوم ہوتا ہے! (20)

---

[1] اس جگہ شیخ فرید نے 'کوزہ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

فرید! شب فراق لامتناہی معلوم ہوتی ہے، میرے پہلو درد
سے جل رہے ہیں۔
لعنت ہے ان کی زندگی پر جو خدا کے سوا کسی اور کی جستجو
کرتے ہیں۔

(21)

فرید! میرا گوشت سرخ انگاروں پر بریاں کیا جائے، اگر
کوئی راز اپنے جگری دوست سے میں نے چھپایا ہو۔

(22)

فرید! بے خبر کسان کیکر بو کر انگور پیدا ہونے کی آس
لگاتا ہے، اور موٹا اون کات اور بُن کر ریشمی
کپڑے پہننا چاہتا ہے۔

(23)

فرید! راہیں کیچڑ سے اٹی ہیں، محبوب کا گھر دور ہے، لیکن
مجھے اس سے گہرا عشق ہے۔
آگے بڑھتا ہوں تو کملی بھیگتی ہے،
رک جاؤں تو عشق جھوٹا ثابت ہوتا ہے

(24)

کملی بھیگ ہی کیوں نہ جائے، کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو
محبوب سے ملنے مجھے جانا ہی ہے، تاکہ میری محبت جھوٹی نہ
ثابت ہو۔

(25)

فرید! کتنا سادہ دل ہوں۔ مٹی کو چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں
کہ عمامہ کہیں میلا نہ ہو جائے، لیکن ایک دن آئے گا
جب یہی مٹی سر میں گھس جائے گی۔ (26)

شکر، شیرینی، مصری، مکھن، بالائی
اے مالک! تیرے پرستار کے لیے ان میں سے کسی میں
بھی وہ لذت نہیں
جو تیرے وصال میں ہے۔ (27)

فرید! میری زندگی تو روٹی کے خشک ٹکڑے پر گزرتی ہے،
کل کتنی سخت ان کی زندگی ہوگی جو اپنے پیالوں کو لذیذ
کھانوں سے بھرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ (28)

(موضوع جاری)
دوست سوکھی روٹی[1] کھا، اور ٹھنڈا پانی پی،
دوسروں کے لذیذ کھانوں پر رشک نہ کر! (29)

---

[1] جو لفظ اس جگہ استعمال کیا گیا ہے، اس کے لغوی معنی ہیں 'لکڑی کی چپٹی روٹی'۔ ممکن ہے کہ اس سلوک میں شیخ فرید نے خود اپنی حالت بیان کی ہو۔ ایک خانقاہ فریدیہ میں حقیقتاً لکڑی کی ایک چپٹی روٹی رکھی رہتی ہے، جس کے بارے میں روایت ہے کہ ریاضتوں کے دوران شیخ فرید اسی قسم کی روٹی کھاتے تھے۔

رات محبوب کی ہم آغوشی مجھے نصیب نہیں ہوئی،
اس محرومی سے میرا انگ انگ دُکھ رہا ہے
برہ کی ماری عورت سے پوچھتا ہوں :
تیری راتیں کس کرب میں گزرتی ہوں گی۔ (30)

(سلوک 31، 32 کا بھی موضوع سابقہ سلوک کے مطابق ہے[1])
وہ جسے نہ تو شوہر کے یہاں چین نصیب ہو، نہ والدین کے گھر میں،
اس عورت کی بھلا کیا متا ہلانہ زندگی ہوگی، محبوب نے جس سے
نظریں پھیر لی ہوں۔ (31)

شوہر کے گھر میں ہو یا والدین کے گھر میں، وہ ہر حال میں اپنے
آقا ہی کی رہتی ہے ـــــ
اس آقا کی جو دسترس سے پرے اور لا انتہا ہے
نانک کہتا ہے کہ سہاگن وہی ہے جسے پیا چاہے[2] (32)

انسانی زندگی اس بنی سنوری عورت کی طرح ہے، جو نہا دھو کر
اور سنگار کر کے بے فکری کی نیند سو رہی ہو۔
بالآخر مشک کی خوشبو غائب ہو جائے گی

---

[1] سلوک 31، 32 کا انداز بیان متصوفانہ ہے۔
[2] یہ سلوک گرونانک کا ہے اور سلوک 31 پر حاشیے کے طور پر لکھا گیا ہے۔

اور صرف بدبو[1] باقی رہے گی۔ (33)

جوانی کے جانے کا مجھے صدمہ نہ ہو، اگر محبوب کا عشق بھی اس کے
ساتھ ہی ختم نہ ہو، بہتوں کی جوانیاں عشق کے عدم استحکام
کی نذر ہو چکی ہیں۔ (34)

فرید! کرب میرا پلنگ ہے اور مصائب اس کی ادوائن، فراق میرا
بستر ہے۔
یہ ہے میری زندگی۔ اے مالک میرے حال پر رحم کر! (35)

(موضوع جاری)
محبوب سے جدائی کا غم ہی زندگی کی جان ہے،
فرید کہتا ہے کہ جو دل اس غم سے خالی ہے، وہ قبرستان ہے۔ (36)

فرید! دنیوی عیش شکر[2] میں لپٹا ہوا زہریلا پھل ہے
کچھ لوگ اس زہریلے پھل کی تخم ریزی کرتے رہتے ہیں
اور کچھ لوگ انھیں چن چن کر کھیتوں سے اکھاڑتے رہتے ہیں۔ (37)

1۔ اس جگہ ہینگ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔
2۔ اس سے مراد عورت ہے۔

فرید! ایک پہر تم نے سیر و تفریح میں ضایع کیا، اور دوسرا
سونے میں خدا جب پوچھے گا، تو کیا حساب بتاؤ گے (38)
زندگی کا!

فرید! سنا تم نے! صور قیامت پھونک دیا گیا
کیا حشر ہوگا اب ہم گنہ گاروں کا۔ (39)

(موضوع جاری)
ہر گھنٹے، چوتھائی گھنٹے کے بعد صور پھونکا جا رہا ہے۔
خوش بیکر محبوب کی آواز مثل صور کے ہے۔
ریاضت کے بغیر تیری شب زندگی بڑی اذیت ناک ہوگی (40.)

شیخ فرید پر بڑھاپا آگیا، جسم کانپنے لگا
زندگی سو برس ہی کی کیوں نہ ہو، بالآخر خاک میں تو ملنا
ہی ہے۔ (41)

مالک! فرید کی تجھ سے التجا ہے کہ کسی اور کے در کا بھکاری
نہ بنانا
اگر تیری یہی مرضی ہو تو میری زندگی ہی کا خاتمہ کر دے۔ (42)

دیکھو لوہار کے کاندھے پر کلہاڑی اور سر پر پانی کی ٹھلیا ہے،

بَن کے ایک پیڑ کو وہ کاٹنا چاہتا ہے۔
فرید کہتا ہے: اے میرے لوہار دوست اس درخت کو چھوڑ دو'
اس کے نیچے بیٹھ کر میں اپنے محبوب کو یاد کیا کرتا ہوں' اسے
کاٹ کر کوئلے کے سوا اور کچھ تیرے ہاتھ نہ آئے گا۔[1] (43.)

فرید! کچھ لوگوں کے پاس نعمتوں کی بہتات ہے
اور کچھ لوگوں کو نمک بھی نصیب نہیں[2]
یہ تو دوسری ہی دنیا میں معلوم ہوگا کہ
پُر معصیت زندگی کے لیے کیسے گرز کھانے پڑتے ہیں۔ (44.)

جو لوگ اپنے لیے نقارے بجواتے ہیں'
جن کے سروں پر چھتر کے سائے کیے جاتے ہیں'
جو اپنی عظمت کے ڈنکے بجواتے ہیں'
انھیں بھی قبرستان ہی میں جگہ ملتی ہے'
وہ بھی لاچار مٹی میں دفن ہو جاتے ہیں۔ (45)

---

[1] اس تفصیلی بیان کی مختلف تشریحیں کی گئی ہیں' لیکن اس جگہ اس کا جو مفہوم پیش کیا گیا ہے' وہ حقیقی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔
[2] اس جگہ شیخ فرید نے شاید اپنا ہی حال بیان کیا ہے۔

(موضوع جاری)

فرید کہتا ہے : جو محلات، دیوان خانے، خلوت خانے تعمیر کراتے ہیں،
ان میں سے کچھ بھی ان کے کام نہ آئے گا،
بالآخر انھیں بھی قبر ہی میں جگہ ملے گی۔ (46)

فرید کہتا ہے: تیری گدڑی میں ہزاروں ٹانکے لگے ہیں
لیکن تیرے جسم میں ایک بھی ٹانکا نہیں ہے۔
اے دوست! سب کو ___ بڑے بڑے مشایخ کو بھی ___ مرنا ہے۔ (47.)

فرید کہتا ہے : ہمارے دونوں کے چراغوں کے روشن ہونے کے
باوجود ملک الموت دبے پاؤں آ ہی جاتا ہے،
آتے ہی قبضہ جما کر پیکر کو تاراج کر دیتا ہے
اور دونوں چراغوں کو گل کر دیتا ہے۔ (48.)

فرید! دیکھو بنولے اور تل کو کس طرح کولھو میں پیرا جاتا ہے،
یہی گنّے کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے،
کاغذ کو کس طرح نذرِ آتش کیا جاتا ہے اور دیگچی کو شعلوں
پر رکھا جاتا ہے، اسی طرح کی سزائیں گنہ گاروں
کو دی جائیں گی۔ (49.)

فرید! لوگوں کے کاندھوں پر جائے نماز ہوتی ہے اور بدن پر
صوف[1]، لیکن ان کے دلوں میں خنجر چھپا رہتا ہے، اور
زبان پر جھوٹی باتیں ہوتی ہیں،
باہر سے وہ چمکیلے نظر آتے ہیں، لیکن ان کا باطن رات کی
طرح تاریک ہوتا ہے۔ (50.)

فرید! ریاضت نے میرے جسم کو گھلا دیا ہے، اس میں کچھ بھی
خون باقی نہیں،
جو خدا کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، ان کے جسم میں رکت
(خون) رتی بھر باقی نہیں رہتا۔ (51)

(گرو امرداس کا اضافہ)
یہ سارا جسم خون ہی تو ہے،
خون کے بغیر جسم باقی نہیں رہ سکتا،
خدا کا خوف جسم کو گھلا دیتا ہے،
ہوس کے خون کو جلا ڈالتا ہے
آگ جس طرح دھات کو صاف کرتی ہے، اسی طرح خدا کا
خوف خیالات کو صاف کرتا ہے،
نانک! صرف وہی حسین ہیں جو خدا کے رنگ میں رنگے ہیں[2]۔ (52)

---

[1] صوف بمعنی اون۔ صوفیوں کا عام لباس
[2] رنگ روحانی زندگی کا استعارہ ہے۔ قرآن میں بھی اسے صبغۃ اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فرید! جس اسمِ اعظم کی تمھیں جستجو ہے، وہ بڑے دریا میں ملے گا،
گندے سے تالاب میں اپنے ہاتھ کو کیوں آلودہ کرتے ہو؟ (53.)

فرید کہتا ہے: جوانی میں خدا سے رغبت نہ ہوئی،
بڑھاپے میں موت نے آدبوچا،
اب قبر میں روح آہ و بکا کرتی ہے:
میرے مالک! میں تجھے پا نہ سکی۔ (54.)

فرید سُن! تیرے سر کے، داڑھی کے اور مونچھ کے بال سفید ہو گئے
اے ناعاقبت اندیش دیوانے انسان! اب تو جاگ،
کیوں اب تک بے سود عیش و عشرت میں مبتلا ہے؟ (55.)

(جاری)
فرید! ناعاقبت اندیشی سے عیش و عشرت میں کب تک مبتلا
رہے گا!
اُٹھ، خدا کی عبادت کر
چند روزہ زندگی کے دن تیزی سے گزرتے جا رہے ہیں۔ (56.)

فرید! محلوں اور کاشانوں پر دل کو نہ رِجھا،
مٹی کے لاانتہا بوجھ تلے جب دبے گا، تو ان میں سے کوئی بھی
کام نہ آئے گا۔ (57.)

(جاری)

فرید! محلات سے اور دولت سے محبت نہ کر
اٹل موت کا ہمہ وقت دھیان رکھ
صرف وہیں کا دھیان رکھ، جہاں بالآخر تجھے جانا ہی ہوگا۔ (58)

فرید! چھوڑ دو ان چیزوں کو جن سے فضیلت حاصل نہیں ہوتی
تاکہ حشر کے دن شرمندگی کا سامنا نہ ہو۔ (59)

فرید! خدا کی عبادت کرو، شکوک کو دل سے نکال دو
خدا پرستوں کو درخت کی طرح صابر ہونا چاہیے۔ (60)

فرید! اس سیاہ لبادے کے باوجود، میں پُر معصیت ہوں،
پھر بھی دنیا مجھے درویش سمجھتی ہے۔ (61)

سیلاب سے تباہ شدہ فصل آب پاشی سے بھی دوبارہ کھڑی
نہیں ہو سکتی،
فرید کہتا ہے: اسی طرح خدا سے برگشتہ لوگوں کو غم سے
نجات نہیں مل سکتی۔ (62)

جب وہ دوشیزہ تھی، تو سہاگن بننے کے لیے اس کا دل بے قرار تھا۔
سہاگ اپنے جلو میں اُلجھنیں لایا

افسوس! اس کی دوشیزگی اب واپس نہیں مل سکتی![1] (63.)

دنیا کے تالاب کے کنارے ہنس[2] کا قافلہ اترا
پانی میں انھوں نے چونچ ڈبوئی نہیں
اپنے پروں کو پھیلاکر وہ اُڑ گئے۔ (64)

ہنس بھوسے کے ایک کھلیان میں اُترے
جاہل لوگوں نے ڈراکر انھیں اُڑا دیا
ان جہلا کو یہ معلوم نہیں ہے
ہنس بھوسے میں چونچ نہیں مارتے۔ (65.)

وہ پرندے اُڑ گئے، جن سے تالابوں میں زندگی تھی۔
اب تالابوں کا پانی خشک ہوجائے گا، صرف کنول[3] کے پھول
رہ جائیں گے۔ (66)

فرید! قبر میں پتھر کا سرہانہ ہوگا،

---

[1] اس کا مفہوم متصوفانہ ہے۔ وہ جو خدا کا متلاشی بھی ہو اور دل میں دنیا کی ہوس بھی رکھتا ہو، وہ ہمیشہ متاسف ہی رہے گا۔
[2] ہنس سے مراد خدا پرست لوگ ہیں۔
[3] کنول کے پھول کا اشارہ بھی خدا پرستوں ہی کی طرف ہے۔

زمیں تیرا بستر ہوگی، کیڑے تیرا گوشت کھا جائیں گے،
ابد تک ایک ہی پہلو تو پڑا رہے گا۔
(67)

فرید! جسم کا حسین گاگر ٹوٹ چکا ہے،
انفاس کی آمد و شد کا مستحکم سلسلہ منقطع ہو چکا ہے،
اب کس مکان میں موت کے فرشتے — عزرائیل کی
آج رات خاطر و مدارات ہوگی!
(68)

(موضوع جاری)
فرید! یہ انجام: حسین گاگر ٹوٹ چکا ہے، انفاس کی
آمد و شد کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔
وہ لوگ جو زمین پر بار تھے، ان کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟
(69)

فرید! کاہل کتیا[1] کی طرح تم نماز چور ہو
تمھاری زندگی بے سود ہے
تم کسی وقت بھی عبادت کے لیے خدا کے گھر میں حاضر نہیں ہوتے۔
(70.)

(جاری)
فرید! علی الصباح اُٹھ، وضو کر، نماز ادا کر

---

[1] اصل میں کتیا کا ہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

جو سر سائیں، (خدا) کے سامنے نہ جھکے، اسے کاندھوں پر
رہنے کا حق نہیں ہے۔ (71)

اس سر کی کیا قدر و قیمت، جو خدا سے سرتابی کرے
ایسا سر اس قابل ہوتا ہے کہ اسے جلا ڈالا جائے، نذرِ آتش
کر دیا جائے۔ (72)

فرید! غور کرو کہاں ہیں تمھارے ماں باپ، جنھوں نے تمھیں
پیدا کیا تھا؟
کبھی ختم نہ ہونے والے سفر پر جا چکے ہیں،
تاہم تیرا دل خود اپنے انجام سے بے خبر ہے۔ (73)

فرید! دل کو صاف اور جذبات کے نشیب و فراز سے پاک رکھ
اس طرح دوزخ کی آگ سے تو محفوظ رہے گا۔ (74.)

(گرو ارجن کا اضافہ)
فرید! خالق خلق میں بستا ہے، خلق اسی کا عکس ہے،
کسی پر نکتہ چینی نہ کرو، خدا سب میں موجود ہے۔ (75)

نال کاٹتے وقت ہی اگر میرا گلا کچھ دبا دیا گیا ہوتا، تو ان
امتحانوں سے، ان مصیبتوں سے نجات مل گئی ہوتی۔ (76)

موتی جیسے دانت، سبک رو پیر، روشن آنکھیں، تیز کان[1]۔
سب رخصت ہو گئے۔
ایسے رفیقوں کی جدائی پر دل سے ایک شور انگیز آہ نکلی ہے۔ (77)

فرید! بدی کا بدلہ نیکی سے دے، دل میں کینہ نہ رکھ،
اس طرح تیرا جسم امراض سے پاک رہے گا، اور حصول مقصد
میں کامیاب ہوگا۔ (78)

فرید! زندگی کا پنچھی اڑ جانے والا مہمان ہے،
دُنیا حسین باغ ہے،
سنو، کوچ کا بگل صبح تڑکے سے بج رہا ہے۔
اگلی منزل کے سفر کے لیے تیار ہو جاؤ! (79)

فرید! نسیم شب کو ہر طرف مشک کی خوشبو پھیلتی ہے،
جو سوتے ہیں، اس نعمت سے محروم رہتے ہیں۔
انھیں بھلا کیا وصال نصیب ہوگا، جن کی آنکھیں نیند سے بوجھل
رہتی ہیں[2]۔ (80)

---

[1] موضوع کی وضاحت کے لیے اعضا کے ساتھ صفات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

[2] یہ اس مجموعے کا بہترین سلوک ہے، جس میں وصالِ خداوندی کی کیفیت متصوفانہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔

فرید! میں جانتا تھا کہ میں ہی دنیا میں دُکھی ہوں، دیکھا تو
ساری دنیا مصائب میں مبتلا ہے۔
کوٹھے پر چڑھ کر اردگرد نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ آگ
گھر گھر پھیلی ہے۔ (81)

(سلوک 82، 83 میں گروارجن نے اسی موضوع پر
اضافہ کیا ہے)

فرید! یہ دنیا بڑی پُرکشش ہے،
اس میں زہریلے پودوں کا بھی ایک تختہ ہے
لیکن اُن پر اس زہر کا اثر نہیں ہوتا، جن پر خدا کی عنایت
ہوتی ہے۔ (82)

فرید! زندگی مسرتوں سے لبریز اور یہ جسم حسین ہے
کم لوگ ایسے ہیں جو دنیا کے نہیں، محبوب حقیقی کے
متلاشی ہوں۔ (83)

عظیم دریا! اپنے کنارے کو نہ کاٹ، مالک کے سامنے تو بھی
جواب دہ ہوگا۔
مگر دریا کی کیا مجال کہ اپنی خواہش سے کسی طرف رُخ کر سکے،
اس کے بہاؤ کی رہنمائی تو خدا ہی کرتا ہے۔ (84)

فرید! تیری طویل زندگی اس طرح بسر ہوئی ہے:
دن رنج واندوہ میں اور راتیں کانٹوں پر گزر رہی ہیں،
اب جب کہ زندگی کا سفینہ کنارے آ لگا ہے، تو کھیون ہار آواز
لگاتا ہے:
'تیری کشتی طوفان کے منہ میں ہے'۔ (85)

(موضوع جاری)
زندگی کا طویل دریا بہتا رہتا ہے، رتیلے کنارے کٹتے
رہتے ہیں، لیکن کشتی محفوظ رہتی ہے، اگر کھیون ہار
ہوشیار ہو! (86)

فرید! دوستی کا دم بھرنے والے تو بہت ہیں، مگر کوئی
سچا دوست نظر نہیں آتا
سچے اور مخلص دوست کی تلاش میں میرا دل آتش خاموش[1]
کی مانند جل رہا ہے۔ (87)

فرید! حواسوں[2] نے روح کو ہلچل میں رکھا ہے، جس سے میں
کرب میں مبتلا ہوں۔

---

[1] اس جگہ جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے معنی ہیں 'اُپلے کی آگ'۔
[2] اس جگہ جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے لغوی معنی ہیں 'جسم'۔

اِن کانوں کو اکھاڑ پھینکوں، اتنا شور و غوغا تو کبھی
نہیں ہوتا تھا ا
(88)

فرید! اس زندگی میں خدا کی یاد ہی سے لذّت پیدا ہوتی
ہے — جنت میں بہنے والی شہد کی نہر اور پکے ہوئے
کھجور کی طرح یہ لذیذ ہوتی ہے۔
یاد رکھو کہ گزرنے والا ہر دن موت کی گرفت کو مضبوط تر
کرتا ہے۔
(89)

فرید! ریاضت نے جسم کو گھلا کر پنجر بنا دیا[2]، کوّے میرے
تلووں پر ٹھونگ مارتے ہیں، لیکن رب کا دیدار
اب تک نصیب نہ ہو سکا، یہ ہیں بندے کے بھاگ!
(90)

(اگلے دو سلوکوں کا بھی یہی موضوع ہے)
اے کوّے! میرے نیم مردہ جسم کا گوشت تو ٹھونگ
مار مار کر تو نوچ چکا ہے، اب میری آنکھوں کو چھوڑ دے،

---

[2] یہ سلوک، اور اگلے دو بھی، موضوع کے اعتبار سے مسلسل ہیں اور جو خیال ان سلوکوں میں پیش کیا گیا ہے، وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی روحانی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے۔ سلوک نمبر 90 'جواہر فریدی' کے ایک سلوک کے مماثل ہے، جو شیخ فرید سے منسوب کیا گیا ہے۔ جواہر فریدی ساتویں صدی عیسوی کے چشتی صوفیوں کا تذکرہ ہے۔

کیوں کہ محبوب کے دیدار کی آس ابھی باقی ہے (91)

اے کوّے! میرے پنجر کو چھوڑ دے، اس جگہ سے اُڑ جا،
میرا گوشت نہ نوچ، یہ جسم میرے محبوب کا مسکن ہے۔ (92)

فرید! سادہ سی قبر انسان کو ابدی آرام گاہ میں آنے کی
دعوت دے رہی ہے۔
وہ کہتی ہے: ڈرو نہیں، یہاں آنے سے مفر نہیں ہے۔ (93)

ان آنکھوں نے وسیع دنیا کو ابدیت میں گم ہوتے دیکھا ہے،
ہر انسان اپنے اعمال کے حساب کتاب میں مبتلا ہے،
مجھے بھی اس سے چھٹکارا نہیں ہے۔ (94)

اے انسان! صفائے قلب پیدا کر،
تب ہی خالق کا وصال اور حقیقی سکون تجھے حاصل ہو سکتا ہے۔
جو خدا کا ہو گیا، دنیا اس کی ہو گئی۔ (95)

زندگی دریا کے کنارے اُگنے والے درخت کی طرح ہے وہ کتنے
دن چل سکتی ہے!
کچے گھڑے میں پانی کتنی دیر رک سکتا ہے! (96)

فرید! عالی شان محلات ویران ہو گئے۔
ان محلوں کے مکین زیرِ زمین جا بسے،
اب سنسان قبریں ان کا مسکن ہیں۔
تو خدا کی بندگی کر، نہ جانے آج جانا ہو یا کل! (97)

فرید! موت صاف نظر آ رہی ہے، جیسے دریا کا دوسرا کنارا
نظر آتا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ وہاں دوزخ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں، کانوں
کو پھاڑ ڈالنے والا شور و غل ہے۔
کچھ لوگوں کو اس حقیقت کا احساس ہے، لیکن بیشتر لوگ
بے خبری کی چادر لپیٹے پھر رہے ہیں۔
یہ سمجھ لو کہ اس دنیا کے اعمال اس دنیا میں ہمارے خلاف
گواہی دیں گے۔ (98)

فرید! زندگی دریا کے کنارے پھدکنے والے بگلے کی طرح ہے،
جس پر یکایک باز جھپٹ پڑے۔
باز خدا کے حکم سے جھپٹتا ہے، اور بگلا پھدکنا بھول جاتا ہے۔
جو بات انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی، یکایک خدا
کے حکم سے ظہور میں آ جاتی ہے۔ (99)

یہ ساڑھے تین من[1] کا جسم دانے پانی پر پلتا ہے۔
انسان بڑی امیدیں لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔
سارے دروازوں کو توڑ کر جب موت داخل ہوتی ہے،
تمام دوست اقارب مجبور ہو کر انسان کو موت کے حوالے کر دیتے ہیں۔
دیکھ انسان! مرنے کے بعد چار آدمیوں کے کاندھوں پر تو جاتا ہے،
فرید! صرف نیکیاں ہی اس دنیا میں کام آتی ہیں۔ (100)

فرید! میری زندگی ان پرندوں[2] جیسی سخت ہے جو سنسان جگہوں
پر زندگی گزارتے ہیں۔
سنگ ریزوں سے اپنی خوراک چنتے ہیں، ریگستانی ٹیلوں پر
رہتے ہیں، تاہم خدا کی طرف سے منہ نہیں موڑتے۔ (101)

فرید! دیکھو موسم بدلتے ہیں، آندھیاں جنگلوں کو ہلا ڈالتی ہیں،
درختوں کی پتیاں جھڑ جاتی ہیں۔
دنیا کے کسی حصے میں جاؤ، انقلابات سے مفر نہیں۔ (102)

فرید! یہ لباس تار تار کر، کملی اوڑھ
جامہ وہ اختیار کر جو تجھے خدا سے قریب لا سکے۔ (103)

---

[1] پُرانے وقتوں میں من کا وزن اس سے کم ہوتا تھا، جتنا آج ہوتا ہے۔
[2] سنسان بیابانوں میں رہنے والے درویشوں کی طرف اشارہ ہے۔

(اضافہ گرو امرداس)
لباس تار تار کرنے سے حاصل ؟ کملی اوڑھنے سے فائدہ؟
نانک! نیت ٹھیک ہو تو گھر بیٹھے ہی خدا کا وصل ہو سکتا ہے! (104)

فرید! جاہ وجلال پر غرور اور حُسن و دولت پر ناز کرنے والے
بارش میں بہہ جانے والے ریگستانی ٹیلوں کی طرح خالی
ہاتھ جائیں گے۔ (105)

فرید سنو! خدا کو بھولنے والوں کے چہرے مسخ ہو جاتے ہیں،
نہ اس دنیا میں انھیں سکون حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اُس
دنیا میں عزت۔ (106)

فرید! زندہ ہونے کے باوجود، تم مُردوں سے بہتر نہیں ہو،
صبح کو تم سوتے رہے، فجر کی نماز ادا نہیں کی
تم خدا کو بھول گئے ہو، لیکن یاد رکھو کہ خدا تمھیں بھولا نہیں ہے! (107)

(سلوک نمبر 111 تک گرو امرداس نے موضوع جاری رکھا ہے)
فرید سنو! خدا سدا بہار ہے، اسے دوام حاصل ہے
مصفا ترین لباس ان کا ہے، جو خدا کے رنگ میں رنگے ہیں۔ (108)

فرید سنو! مسرت و الم کو یک ساں برداشت کرو، بُرے

خیالات سے دل کو پاک رکھو،
مشیتِ الٰہی کے آگے سر جھکانے والے ہی دربارِ خداوندی
میں باریاب سکیں گے۔
(109)

فرید سنو! دنیا طرح طرح کے مصائب کا گھر ہے، وہی حال
انسان کا بھی ہے،
صرف اسی کو اس سے مفر مل سکتا ہے جسے اللہ[1] کی پناہ
حاصل ہو۔
(110)

فرید! ہمارے دل بے مصرف دنیا کے رنگ میں رنگے ہیں۔
خداپرستوں کی زندگی بڑی کٹھن ہوتی ہے۔
یہ رتبہ تو خوش قسمتی[2] ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔
(111)

رات کے پہلے پہر کی عبادت پھول ہے اور رات گئے کی عبادت
پھل ہے۔
شب بیداری کرنے والوں پر خدا کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔
(112)

---

[1] یہ قابل لحاظ ہے کہ گرو نے اس جگہ 'خدا' کے لیے 'اللہ' کی اصطلاح استعمال کی ہے
جو خالص اسلامی ہے۔
[2] اس جگہ 'کرما' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جس کے معنی ہیں نیک کاموں سے حاصل
ہونے والا پھل۔

(اضافہ گرونانک[1])
خدا کی رحمت زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتی۔
شب بیداری کے باوجود، کچھ لوگوں کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی
اور کچھ لوگوں کو بیدار کر کے خدا اپنی رحمت عطا کرتا ہے۔ (113)

تم جو اپنے خاوند کی نظرِ عنایت کی منتظر ہو،
اس حُسن کے باوجود، آخر تم میں کمی کیا ہے؟
سنو! متاہلانہ زندگی کی حقیقی مسرتیں رفیقِ حیات کی تابعداری ہی
سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ (114)

صبر و تحمل کو کمان بناؤ، اور تیر کا کام بھی اسی سے لو،
خدا تمھارے نشانے کو کبھی خطا نہ ہونے دے گا! (115)

(اگلے دو سلوکوں کا بھی یہی موضوع ہے)
جو صبر و تحمل کی راہ اختیار کرتے ہیں، اور مصائب برداشت کرتے
ہیں، ان ہی کو خدا کا قرب حاصل ہوگا، ان کی پوشیدہ
قوت کا کسی کو علم نہ ہوگا۔ (116)

صبر و تحمل کو اپنا نصب العین بناؤ اور کوشش کر کے اس گن کو

---

[1] آدی گرنتھ کے صفحہ 83 پر یہی سلوک گرونانک کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

حاصل کرو، پھر تم، چھوٹی نہر نہیں، عظیم دریا بن
جاؤ گے۔
(117)

فرید! درویشی سخت ریاضت ہے، سطحی نہیں
کم ہی ایسے ملتے ہیں، جو درویشی کی راہ اختیار کرتے ہوں!
(118.)

میرا تن تنور کی طرح تپ رہا ہے، ہڈیاں اس کا ایندھن بن
بن گئی ہیں۔
لیکن میں بڑھتا رہوں گا، پیر تھک گئے، تو سر کے بل چلوں گا
محبوب کے وصال کے لیے!
(119)

(مقدس گرودوں کا اضافہ)
نہ جسم کو تنور بنانے کی ضرورت ہے، نہ ہڈیوں کو ایندھن بنانے
کی حاجت!
سر اور پیر نے تمھارا کیا بگاڑا ہے، محبوب تو تیرے اندر ہی موجود
ہے، اس کے دیدار سے لذت اندوز ہو[1]!
(120.)

میں سجن کی تلاش میں سرگرداں ہوں، اور سجن میرے
ساتھ ہی ہے،

---

[1] معمولی سی لفظی ترمیم کے ساتھ یہی بات گرونانک نے بھی کہی ہے۔ دیکھو آدی گرنتھ: صفحہ 1411

وہ نظر نہ آنے والا کیوں کر نظر آئے، ہاں مرشد کی وساطت سے
اس کا دیدار ممکن ہے![1] (121)

ہنس کے شان دار جوڑوں کو پانی میں دیکھ کر بگلوں کو بھی اسی
طرح پیرنے کی ریس پیدا ہوئی۔
غریب بگلے پانی میں سر کے بل گر کر ڈوب گئے[2] 122

میں نے ایسے کی رفاقت اختیار کی، جو مجھے ہنس جیسا نظر آیا تھا
اگر معلوم ہوتا کہ وہ کم بخت بگلا ہے، تو میں اس سے دور ہی رہتا۔ (123)

(اضافہ گرو نانک)
ہنس اور بگلوں کا ذکر نہ کرو — اس کا کرم چاہیے
نانک کہتا ہے: اس کا حکم ہو تو کوا بھی ہنس بن سکتا ہے![3] (124)

کنار آب ایک پرندہ تنہا بیٹھا ہے، اس کے گرد بہت سے
جال پھیلے ہیں۔

---

[1] یہ سلوک گرو رام داس کا ہے — دیکھیے گرو گرنتھ: صفحہ 585 : رام راگ
[2] سلوک نمبر 122، 123 گرو امر داس کے ہیں — دیکھیے آدی گرنتھ: صفحہ 585 : راگ ودھان
[3] یہ سلوک معمولی سی لفظی ترمیم کے ساتھ گرو نانک کے سری راگ میں بھی ملتا ہے۔
— آدی گرنتھ: صفحہ 82

انسان بھی اسی طرح خواہشات کا شکار رہتا ہے۔ بس خدا کا
فضل ہی اسے بچا سکتا ہے۔ (125)

کون سے الفاظ، کون سا گن، کون سا طرزِ تکلم، کون سی وضع
ہے، جو مالکِ حقیقی کو ملتفت کر سکتی ہے؟ (126)

(موضوع جاری — از گرونانک)
وہ الفاظ انکساری کے ہیں، وہ گُن عفو ہے، وہ طرزِ تکلم شیریں
بیانی ہے،
سہیلیو! یہی تین صفات ہیں، جن سے مالکِ حقیقی کا التفات
حاصل ہو سکتا ہے۔ [۵] (127)

عقل رکھنے کے باوجود اپنے کو نا سمجھ جاننے والے،
قوی ہونے کے باوصف اپنے کو بے حقیقت متصور کرنے والے،
اپنی تھوڑی سی پونجی میں بھی دوسروں کو شریک کرنے والے،
ایسے خدا پرست کم ہی ہوتے ہیں۔ (128)

---

۵ پرروتن جنم ساکھی کا پہلے بھی نام لیا جا چکا ہے۔ اس کتاب میں یہ سلوک گرونانک سے منسوب کیا گیا ہے۔ انھوں نے شیخ برہم (ابراہیم) سے مکالمت کے دوران یہی جواب دیا تھا۔

کسی سے بھی ترش کلامی نہ کرو، سب میں خدا موجود ہے،
کسی کا دل نہ توڑو، ہر ایک دل کو بیش بہا موتی سمجھو۔ (129)

(موضوع جاری)
ہر دل ایک موتی ہے، دل کو توڑنا بُرا ہے،
محبوبِ حقیقی کا متلاشی ہے، تو کسی کا بھی دل نہ توڑ! (130)

آدی گرنتھ۔ ص ص 1377 تا 1384

خوشنویس : ایس، ایم، مظہر

کتابیات

1- انگریزی

Macauliffe, M.A. - The Sikh Religion-Vol. 6.

Encyclopaedia of Islam

Encyclopaedia of Ethics and Religion

Idries Shah-The Way of the Sufi

Hughes Dictionary of Islam

S. Radhakrishnan-History of Philosophy, Eastern and Western-2 Volumes

M. Mujeeb-The Indian Muslims

Gazetteers-Multan and Montgomery Districts of Undivided Punjab

Imperial Gazetteer of India

A.J. Arberry-Sufism

Dr. Mir Valiuddin-The Quranic Sufism

"The Influence of Sufism on Traditional Persian Music",
article by Seyyed Hossein Nasr in Studies in Comparative Religion, (Autumn 1972)

2 Adi Granth and several of its commentaries for the rendering of the Bani.

3- فارسی

شیخ اللہ دیا (سترھویں صدی) سیر الاقطاب
سید محمد مبارک (800 ہجری مطابق 1400 عیسوی) سیر الاولیا
شیخ عبد الحق محدث (985 ہجری مطابق 1580 عیسوی) اخبار الاخیار
حمید قلندر (756 ہجری مطابق 1376 عیسوی) خیر المجالس
ڈاکٹر جلال ہمائی (تہران) غزالی نامہ
علی عثمان ہجویری : کشف المحجوب
محمود شابستری (چودھویں صدی) گلشن راز
پیر بخش : ابیات شیخ فرید (فارسی رسم الخط میں پنجابی سہ حرفی)
(اس کتاب میں شیخ فرید کی تربیت کی تفصیل بیان کی گئی ہے)

4 - اُردو

جواہر فریدی
اسرار الاولیا
ارشاداتِ فریدی (از پیر محمد حسین شاہ اور جے شی رام مشتاق)
تاریخ مشائخ چشت (از خلیق احمد نظامی)

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی مطبوعات

بوند اور سمندر امرت لال مترجم: رضیہ سجاد ظہیر

اس ناول کا مرکزی خیال فرد اور سماج کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے۔ وہ کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔ بوند فرد ہے اور سماج سمندر۔ آج فرد اور سماج کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے یا بگڑا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ۲۸/۷۵

ہندی کے یک بابی ڈرامے مرتبہ: چندر گپت ودیالنکار مترجم: ڈاکٹر محمد حسین

زیرِ نظر مجموعہ ہندی کے یک بابی ڈرامے کے مختلف اسلوب و انداز پیش کرنے والا اہم انتخاب ہے۔ اس میں ہندی کے دس جانے پہچانے ڈراما نگاروں کے بہترین ڈرامے شامل ہیں۔ قیمت ۱۲/۵۰

میلا آنچل بھونیشور رینو مترجم: سلمیٰ صدیقی

یہ ہے 'میلا آنچل' ایک ناول مقامی رنگ لیے ہوئے۔ اس میں پھول بھی ہیں، کانٹے بھی، دھول بھی ہے اور گلال بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار ان میں سے کسی سے بھی دامن بچا کر نہیں نکل پاتا۔ 'میلا آنچل' عالمی ناول کہا جا سکتا ہے۔ قیمت ۱۸/۷۵

راگ درباری شری لال شکلا مترجم: راشد سہسوانی

'راگ درباری' کو ہندی میں با مقصد طنز نگاری کی شروعات کہا گیا ہے یہ کسی طرح بھی کلاسیکی ناول سے کم نہیں ہے۔ مختلف طرز کے پلاٹ، ایک نئی ٹیکنک اور زبان و بیان کی خوبیوں سے بھرپور ناول۔ قیمت ۱۵/۵۰

مطبوعات نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

آبادی — مصنف: ڈاکٹر ایس اگروال — ترجمہ: مخمور جالندھری — ۵/۲۵
پنڈت وشنو دگمبر — " ڈی آر اٹھاولے — " شش۔ قدوائی — ۲/۲۵
عظیم باغی — " ڈی کنکٹیڈ — " ڈاکٹر پرماتما سرن — ۶/۲۵
قاضی نذرالاسلام — " بسودھا چکرورتی — " عرش ملسیانی — ۲/۲۵
کچھوا اور خرگوش — " ڈاکٹر ذاکر حسین — غیر مجلد ۱/۰۰ مجلد ۲/-
کبیر — " ڈاکٹر پارس ناتھ تیواری — " ایم، کے درانی — ۲/۵۰
گرونانک — " گوپال سنگھ — " مخمور جالندھری — ۳/-
مٹتی بنتی تصویریں — " بھگوتی چرن ورما — " رضیہ سجاد ظہیر — ۵/-
تاش کے محل (ناول) — " پیال رنگنایکما — " زینت ساجدہ — ۵/۵۰
سفید خون — " نانک سنگھ — " رتن سنگھ — ۸/-
گرو گوبند سنگھ — " ڈاکٹر گوپال سنگھ — " مخمور جالندھری — ۳/-
زندگی ایک ناٹک — " پنالال پٹیل — " کشور سلطانہ — ۱۰/-
رنجیت سنگھ — " ڈی، آر، سود — " مخمور جالندھری — ۲/۷۵
جدوجہد آزادی — " بپن چندر — " غلام ربانی تاباں — ۵/۵۰
بنگرواڑی — " ڈنکیٹش ماڈگولکر — " عرش ملسیانی — ۵/۲۵
شاعر — " تاراشنکر بندوپادھیائے — " پرمیش کمار ڈے — ۸/۷۵
موت کے بعد — " شیورام کارنت — " محمود سروش — ۸/۷۵
آدمی کے روپ — " یش پال — " سہیل عظیم آبادی — ۱۲/-



بابا شیخ فرید کو مسلمانوں میں ایک عظیم
روحانی شخصیت تسلیم کیا جاتا ہے۔ بابا فرید کے
ملتانی پنجابی کلام کا مطالعہ گرونانک اور بعد
کے گروؤں نے کیا اور اسے گرنتھ صاحب میں
جگہ دی گئی۔ یہ ایک منفرد اور عظیم الشان واقعہ
ہے جو مختلف مذاہب کے درمیان رابطے کا
مظہر بھی ہے۔

اس کتاب کے مصنّف پروفیسر گُربچن سنگھ
طالب ہیں، جو گرو گوبند سنگھ اور گرو نانک جیسی
کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ وہ آج کل پنجابی
یونیورسٹی پٹیالہ کے 'مذہبیات کے تقابلی
مطالعہ' کے شعبے میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

قیمت Rs. 7.25

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا